تدبّر
لاہور

جاری کردہ:

مولانا امین احسن اصلاحی

مدیر:

خالد مسعود

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبرِ قرآن و حدیث

لاہور - پاکستان

قرآن حکیم

- نفیس کتابت
- سلیس ترجمہ : مولانا امین احسن اصلاحیؒ
- حاشیہ : مشتمل بر اخذ و تلخیص از تفسیر تدبر قرآن خالد مسعود
- سفید زمین اور نیلے حاشیہ کے ساتھ عمدہ طباعت
- خوبصورت جلد اور کور
- سائز 20X30/8 صفحات 1008 قیمت 550 روپے

ناشر: فاران فاؤنڈیشن 122 فیروز پور روڈ لاہور

1- **تدبر حدیث** شرح صحیح بخاری [illegible]

2- **تدبر حدیث** شرح موطا امام مالک [illegible]

از

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

- ترتیب و تدوین : خالد مسعود، سعید احمد، سید اسحاق علی
- فہم حدیث کا ایک نیا انداز
- خوبصورت طباعت و جلد بندی
- سائز 20X30/8 صفحات 544 , 580
- قیمت: 360 روپے، 350 روپے

ناشر: ادارہ تدبر قرآن و حدیث، رحمان سٹریٹ مسلم روڈ، سمن آباد لاہور

ملنے کا پتہ: دارالتذکیر رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

تدبّر

لاہور

جاری کردہ

مولانا امین احسن اصلاحی

مُدیر:

خالد مسعود

شمارہ 78

دسمبر 2002ء

شوال 1423ھ

مجلس ادارت

عبداللہ غلام احمد (مدیر مسئول)

محبوب سُبحانی

سعید احمد

سید اسحاق علی

قیمت 12.50 روپے

سالانہ 50.00 روپے

بیرون ملک 250.00 روپے

(ماسوائے برصغیر)

فہرست

تذکرہ و تبصرہ

ایک مخلص خادم اسلام کی رحلت / خالد مسعود ... 2

تدبر قرآن

تفسیر سورہ بقرہ (۲) / حمید الدین فراہیؒ / ڈاکٹر عبداللہ فراہی ... 5

تدبر حدیث

درس صحیح بخاری / امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی ... 20

درس موطا امام مالک / امین احسن اصلاحی / ماجد خاور ... 31

مقالات

قرآن مجید کی جمع و تدوین / خالد مسعود ... 41

مراسلہ و مذاکرہ

خواتین کی اصلاح کا طریقہ / امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی ... 49

ناشر: ادارہ تدبر قرآن و حدیث رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد، لاہو

خالد مسعود

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک مخلص خادم اسلام کی رحلت

دنیائے اسلام کے نامور محقق اور مصنف ڈاکٹر محمد حمید اللہ ماہ دسمبر ۲۰۰۲ء کے تیسرے ہفتہ کے دوران امریکہ کی ریاست فلوریڈا میں انتقال کر گئے۔ وہ ۱۹۰۸ء میں حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ ابتدا سے لے کر ایم اے اور ایل ایل بی تک کی تعلیم دولت آصفیہ کے تعلیمی اداروں اور عثمانیہ یونیورسٹی سے حاصل کی اور اسی یونیورسٹی میں تدریس وتحقیق کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی گئے اور بین الاقوامی قانون کے موضوع پر ڈی فل کی سند حاصل کی۔ جرمنی سے فرانس گئے اور سوربون یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی سند حاصل کی۔ اسی دوران میں ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی اور اس کے کچھ عرصہ بعد بھارت نے ریاست حیدر آباد پر قبضہ کر لیا۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کو اس سانحہ کا اتنا صدمہ ہوا کہ انہوں نے واپس اپنے وطن جانا گوارا نہ کیا اور پیرس میں رہائش اختیار کر لی۔ وہ زندگی بھر پیرس کے ایک علمی وتحقیقی ادارہ Centre Nationale de la Researche Scientifique سے وابستہ رہے۔ آخری عمر میں بیمار رہنے لگے تو امریکہ میں اپنے عزیزوں کے ہاں چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

ڈاکٹر صاحب کی تحقیقات کا دائرہ خاصا وسیع ہے جس میں سیرت النبی کے سیاسی پہلو، رسول اللہ کے معاہدات ووثائق اور اسلامی قانون کی ترتیب وتدوین پر ان کا کام بے حد وقیع ہے۔ چونکہ ان کی علمی تربیت جرمنی اور پیرس میں ہوئی اس لیے انہوں نے مغربی اہل تحقیق کے طریقوں کو اپنایا اور بڑی خوبی سے استعمال کیا۔ اسی لیے ان کے کام کی مغرب میں بھی خوب پذیرائی ہوئی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب محض تحقیق برائے تحقیق کے قائل نہ تھے۔ ان کی سوچ خالص اسلامی تھی، وہ عملی مسلمان تھے اور اسلام کی خدمت ان کا شعار تھا۔ چنانچہ انہوں نے مسلمان اہل علم کے نقطہ نظر کو جدید اسلوب میں پیش کیا اور مداہنت سے بالکل کام نہیں لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرانسیسی زبان میں قرآن حکیم کا ترجمہ کر کے اور سیرت النبی پر کتابیں لکھ کر فرانس کے مسلمانوں کے لیے بڑی دینی خدمت انجام دی۔ وہ ایک کامیاب مبلغ اسلام تھے۔ ان کے ہاتھوں پر ہزاروں فرانسیسیوں نے اسلام قبول کیا۔ وہ زندگی بھر فرانس کے مسلمانوں کی عقیدت کا مرکز رہے اور ان کی بہبود کے لیے کام کرتے رہے۔

مغرب کی لائبریریوں میں تحقیق کے دوران انہیں حضرت ابو ہریرہؓ کے ایک شاگرد ہمام بن منبہؒ کا مرتب کردہ صحیفہ ہاتھ لگا تو انہوں نے اس کی نقل حاصل کی اور اس میں شامل احادیث کا استخراج کیا۔ حدیث کے مجموعوں میں ان احادیث کی روایت کا اس صحیفہ کی روایت سے تقابل کر کے یہ ثابت کیا کہ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اپنے نتائج تحقیق کو انہوں نے کتابی شکل دی۔ اس سے دو باتیں ثابت ہوئیں۔ ایک یہ کہ نبی ﷺ سے قریب العہد زمانہ میں بھی احادیث مدون کرنے کی کوششیں ہوئیں، دوسری یہ کہ رواۃ حدیث نے بڑی احتیاط سے احادیث کو بعد والوں تک پہنچانے کی سعی کی۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ اسلامی فقہ سلطنت روما کے قانون کی خوشہ چینی نہیں ہے بلکہ یہ مسلمان علماء کی کاوشوں کا نتیجہ ہے اور بین الاقوامی قانون کے بانی مغربی مفکرین نہیں بلکہ مسلمان فقہا ہیں۔

اہل علم، بالخصوص مخلص، باکردار خادمین اسلام کا دنیا سے اٹھ جانا معمولی حادثہ نہیں ہوتا۔ یہ ان کے اعزہ واقربا یا تلامذہ ہی کا نقصان نہیں ہوتا بلکہ پوری امت مسلمہ کا نقصان ہوتا ہے کیونکہ ان کا وجود امت کے لیے عظیم سرمایہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی خدمات کو شرف قبول عطا فرمائے، ان کی نیکیوں کا بھرپور اجر دے، ان کی کوتاہیوں سے صرف نظر فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔

ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی کا اعزاز:

ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی مدرسۃ الاصلاح سرائے میر (انڈیا) کے سابق ناظم مولانا محمد ایوب اصلاحی کے صاحبزادے اور مولانا حمید الدین فراہیؒ کے شاگرد خاص مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کے نواسے ہیں۔ مدرسۃ الاصلاح سے ۱۹۷۱ء میں سند فراغت حاصل کی، ۱۹۷۳ء میں ندوۃ العلماء لکھنو سے ادب عربی میں تخصص کیا۔ ۱۹۷۹ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم اے عربی اور ۱۹۸۴ء میں لکھنو یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا۔ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۶ء تک تین سال مدرسۃ الاصلاح میں استاذ ادب عربی کی حیثیت سے کام کیا۔ ڈیڑھ سال تک نئی دہلی کے عربی رسالہ ثقافۃ الہند کے اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے۔ ۱۲ سال جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں بحیثیت استاد تعینات رہے۔ اس کے بعد ۱۹۹۴ء سے وزارت اسلامی امور سعودی عرب کے علمی وتحقیقی ادارہ مرکز البحوث والدراسات الاسلامیہ ریاض میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب شروع سے علم وتحقیق کے آدمی رہے ہیں۔ انہوں نے مدرسۃ الاصلاح کے طلبہ کے لیے محاسن الشعر کے نام سے عربی شاعری کا ایک انتخاب مرتب کیا جسے بعد میں مدرسہ کے

نصاب میں شامل کرلیا گیا۔ انہوں نے عربی اور اردو میں بے شمار مقالات تحریر کیے جو ہندو پاک کے علاوہ مشرق وسطی کے موقر جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی مرحوم کی فرمائش پر انہوں نے ان کی دو کتابوں کے ترجمے عربی اور اردو میں کیے جو ۱۹۷۵ء میں چھپ بھی گئے تھے۔

ڈاکٹر محمد اجمل مشرق وسطی میں مولانا حمید الدین فراہیؒ کو متعارف کرانے کا ذریعہ بنے ہیں۔ انہوں نے امعان فی اقسام القرآن، الرای الصحیح فی من هو الذبیح اور مفردات القرآن، جو مولانا فراہیؒ کی تصانیف میں ان کے فکر کے حوالہ سے بے حد اہمیت کی حامل کتب ہیں، کو نہایت صحت کے ساتھ اور تعلیقات و حواشی سے مزین کر کے دار القلم دمشق اور دار الغرب الاسلامی بیروت سے شائع کیا ہے۔ اکتوبر ۲۰۰۰ء میں مجمع الملک فهد لطباعة المصحف الشریف المدینة المنورہ کی جانب سے قرآنیات پر ایک سہ روزہ مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا۔ اس میں ڈاکٹر صاحب کو بھی بطور مقرر دعوت دی گئی تو انہوں نے اس اجتماع میں مولانا فراہیؒ کا تفصیلی تعارف کرایا اور ان کی کتاب مفردات القرآن کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔

ڈاکٹر صاحب کی اعلیٰ علمی خدمات کا لحاظ کرتے ہوئے عالم عرب کے ممتاز و مستند ادارہ مجمع اللغة العربیة دمشق، نے ان کو اپنا اعزازی رکن منتخب کیا ہے۔ گویا اس علمی ادارہ نے ان کا شمار عہد حاضر کے ممتاز اہل علم اور محققین نے کیا اور ان کی خدمات کو تسلیم کیا ہے۔ اس اعزاز پر ہم ڈاکٹر محمد اجمل صاحب کو ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔ یہ اعزاز انہی کو حاصل نہیں ہوا بلکہ اس میں بالواسطہ ان کے گرامی قدر والد مولانا محمد ایوب اصلاحی اور خود ان کی مادر علمی مدرسۃ الاصلاح بھی شریک ہیں۔ اللہ کریم ڈاکٹر صاحب کو مزید علمی خدمات کی توفیق ارزانی فرمائے اور وہ فکر فراہی کو اہل عرب میں روشناس کرانے میں پہلے سے بھی زیادہ موثر رول ادا کریں۔

علامہ حمید الدین فراہی

ترجمہ: ڈاکٹر عبید اللہ فراہی

تفسیر سورۃ البقرۃ

-۲-

هُدًى: یہ هدی یهدی کا مصدر ہے۔ اس سے جو افعال آتے ہیں ان کے مختلف استعمالات پر ہم سورہ فاتحہ کی تفسیر میں گفتگو کر چکے ہیں اور جہاں تک اس لفظ کا تعلق ہے تو جس طرح دوسرے مصادر مختلف معنوی پہلو رکھتے ہیں اسی طرح اس کے بھی حسب ذیل معنوی پہلو ہیں۔

۱۔ قلبی نور و بصیرت۔ قس بن ساعدہ کہتا ہے:

والذی قد ذکرت دل علی الله نفوسا لها هدی و اعتبار (شعراء النصرانیہ: ۲۱۲)

﴿تمہاری باتوں نے ان لوگوں کو، جن میں بصیرت اور عبرت پذیری کی صلاحیت تھی، اللہ تعالیٰ کا راستہ دکھایا۔﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ. (محمد: ۱۷)

﴿اور جن لوگوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی اللہ نے ان کی قلبی بصیرت میں اضافہ فرمایا اور ان کے حصے کی پرہیزگاری ان کو عطا کی۔﴾

ایک اور جگہ فرمایا:

وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا. (سجدہ: ۱۳)

﴿اور اگر ہم چاہتے تو ہر ایک کو اس کی قلبی بصیرت عطا کر دیتے﴾

۲۔ دلیل و حجت اور نشان راہ، جیسا کہ آیت ذیل میں ہے:

أَوْ أَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى. (طٰہٰ: ۱۰)

﴿یا مجھے آگ کے پاس کوئی نشان راہ مل جائے﴾

دوسرے مقام پر ہے:

وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَ الْفُرْقَانِ (بقرہ:۱۸۵)

﴿اور واضح دلائل اور حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن چیز کے ساتھ﴾

ایک اور جگہ آیا ہے:

بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتَابٍ مُّنِيْرٍ (حج:۸)

﴿بغیر کسی علم، بغیر کسی دلیل اور بغیر کسی روشن کتاب کے﴾

۳۔منزل تک پہنچانے والا صاف کھلا راستہ۔امرؤالقیس کہتا ہے:

و من الطريقة جائر و هدى قصد السبيل و منه ذو دخل (دیوان امرئ القیس:۲۳۸)

﴿کوئی راستہ کج ہوتا ہے، اور کوئی سیدھا منزل تک پہنچانے والا، اور کسی راستے میں خرابیاں ہوتی ہیں﴾

قرآن مجید میں ہے:

إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ (حج:۶۷)

﴿بے شک تم سیدھے راستے پر ہو﴾

یہیں سے یہ لفظ سنت اور شریعت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ فرمایا:

فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ (انعام:۹۰)

﴿پس ان کی سنت (طریقہ) کی پیروی کرو﴾

نیز فرمایا:

إِنَّ الْهُدَىٰ هُدَى اللّٰهِ (آل عمران:۷۳)

﴿اصل طریقہ تو بس اللہ کا بتایا ہوا طریقہ ہے﴾

۴۔فعل ہدایت، مصدری معنی میں، جیسا کہ فرمایا ہے:

إِنْ تَحْرِصْ عَلَىٰ هُدَاهُمْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ (نحل:۳۷)

﴿اگر تم ان کو ہدایت دینے کے بہت خواہش مند ہو تو اللہ انہیں ہدایت نہیں دیا کرتا جن کو گمراہ کر دیتا ہے۔﴾

دوسری جگہ ہے:

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ (بقرہ:۲۷۲)

﴿تمہارے ذمہ ان کو ہدایت دینا نہیں ہے بلکہ اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔﴾

ایک اور جگہ ہے:

إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ (لیل:۱۲)

﴿بے شک ہمارے اوپر منحصر ہے ہدایت دینا۔﴾

یہ تمام استعمالات عربی زبان کے لحاظ سے ہیں۔

عربوں کا طریقہ ہے کہ وہ چیزوں کے نام ان کی بعض نمایاں خصوصیت پر رکھتے ہیں۔ اسی اسلوب پر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کا نام مذکورہ بالا تمام معنوی پہلوؤں کے اعتبار سے "ھدی" رکھا ہے کیوں کہ یہ لفظ ان تمام خصوصیات کا جامع ہے۔ جس طرح ایک چیز کے کئی نام ہوتے ہیں اسی طرح "ھدی" بھی کتاب الٰہی کے ناموں میں سے ایک نام ہے، جیسا کہ ایمان لانے والے جنوں کے قول کا حوالہ دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَ أَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدَىٰ آمَنَّا بِهِ (جن:۱۳)

﴿اور یہ کہ جب ہم نے کتاب ہدایت کو سنا تو ہم اس پر ایمان لائے۔﴾

نیز فرمایا ہے:

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُّؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (اسراء:۹۴)

﴿اور ان لوگوں کے ایمان لانے سے جبکہ ان کے پاس کتاب ہدایت آ گئی نہیں روکا مگر اس چیز نے کہ وہ کہنے لگے کہ کیا اللہ نے ایک بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔﴾

ایک اور جگہ ہے:

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (بقرہ:۳۸)

﴿تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔﴾

یعنی میری طرف سے کوئی وحی آئے۔ یہاں "ھدی" وحی کے معنی میں ہے، اور یہ اس کا پانچواں مفہوم ہے جو پچھلے تمام معنوی پہلوؤں کا جامع ہے۔ اس کی تفصیل چودھویں فصل میں آئے گی۔

للمتقین: حرف لام یہاں انتفاع کے لیے ہے یعنی اس کتاب سے فائدہ وہی لوگ اٹھائیں گے جو متقی ہیں۔ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

"متقین" کا لفظ "اتقاء" سے ہے اور اتقاء جیسا کہ واضح ہے وقی یقی سے باب افتعال

میں مصدر ہے۔ اس کے فعل مجرد کے دو مفعول آتے ہیں جیسا کہ اس آیت میں ہے:

فَوَقَاهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ (-۱۱)

﴿تو اللہ نے ان کو اس دن کی آفت سے بچا لیا۔﴾

یعنی ان کو اس سے محفوظ رکھا، لیکن باب افتعال سے اس کا ایک ہی مفعول آتا ہے، مثلاً اتقیت الشر (میں نے آفت سے اپنے آپ کو بچایا)، اتقیت السیف بالترس (تم نے ڈھال کو اپنے اور تلوار کے درمیان رکاوٹ بنایا)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

أَفَمَنْ يَتَّقِي بِوَجْهِهِ سُوءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. (زمر:۲۴)

﴿کیا وہ جو اپنے چہرے کو روز قیامت عذاب بد کی سپر بنائے گا۔﴾

نابغہ کا شعر ہے:

سقط النصیف ولم ترد اسقاطه　　فتناولته واتقتنا بالید (دیوان نابغہ:۹۳)

﴿غیر ارادی طور پر دوپٹہ سر سے گرا تو اس نے ایک ہاتھ سے اسے سنبھالا اور دوسرے سے اپنے چہرے کو ڈھانپ لیا کہ ہماری نظر نہ پڑے۔﴾

ایک حدیث میں ہے:

اتقوا النار ولو بشق تمرة (متفق علیہ)

﴿جہنم کی آگ سے بچاؤ کی سبیل ڈھونڈو خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے ہی کے ذریعہ کیوں نہ ہو جسے فقراء کو دے دو۔﴾

اور کبھی کبھی ''تجرید'' کے طور پر اصل مفہوم سے الگ کر کے محض کسی چیز کو اپنے آگے رکاوٹ بنانا اس سے مراد ہوتا ہے، جیسا کہ امرؤ القیس کے اس شعر میں ہے:

تصد و تبدی عن اسیل وتتقی　　بناظرة من وحش و جرة مطفل

(دیوان امرئ القیس:۱۶)

﴿وہ رخ پھیرتی ہے تو اس کے لیے نرم رخسار نمایاں ہو جاتے ہیں اور نظر اٹھاتی ہے تو اس کی آنکھیں جیسے مقام وجرہ کی کسی نیل گائے کی آنکھیں ہوں جس کے ساتھ اس کا بچہ بھی ہو۔﴾

یہاں پر ''تتقی'' کا لفظ خوف کے مفہوم سے خالی ہے اور ایسا بہت کم استعمال ہوتا ہے کیوں کہ ''اتقاء'' کے اصل معنی میں کسی نقصان کا خوف یا اندیشہ لازماً پایا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کے حسب

ذیل چار وجوہ استعمالات ہیں:

۱۔ جس چیز سے نقصان پہنچنے کا ڈر ہو اس سے بچنا، جیسا کہ اس آیت میں ہے:

إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً (آل عمران:۲۸)

﴿مگر یہ کہ تم ان سے بچو جیسا کہ بچنے کا حق ہے﴾

دوسری جگہ ہے:

فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا. (مزمل:۱۷)

﴿اگر تم نے کفر کیا تو اس دن سے کیسے بچ سکو گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا﴾

۲۔ کسی آفت کے ظہور سے خوف کھانا، جیسا کہ آیت ذیل میں ہے:

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً. (انفال:۲۵)

﴿اس آفت سے خوف کھاؤ جو خاص کر کے ان ہی پر نہیں آئے گی جنہوں نے تم میں سے ظلم کا ارتکاب کیا ہوگا۔﴾

دوسرے مقام پر ہے:

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ. (آل عمران:۱۳۱)

﴿اور اس آگ سے خوف کھاؤ جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے﴾

ایک اور جگہ آیا ہے:

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللّٰهِ. (بقرہ:۲۸۱)

﴿اور اس دن سے خوف کھاؤ جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔﴾

۳۔ اس منعم پاک کے سامنے ہمیشہ خشوع کی حالت میں رہنا جو اپنے شکر گزار اور وفادار بندوں پر رحم فرماتا ہے، کفر و معصیت کو ناپسند کرتا ہے اور ہر چیز سے باخبر ہے۔ اس پہلو سے یہ لفظ 'رهبة' سے ملتا جلتا ہے جیسا کہ آیت ذیل میں آیا ہے:

إِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ. (انفال:۲۹)

﴿اگر تم اللہ سے برابر خوف کھاتے رہے تو وہ تمہارے لیے فرقان نمایاں کر دے گا اور تم سے تمہاری برائیوں کو دور کر دے گا۔﴾

دوسری جگہ ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (تغابن:۱۶)

﴿تو اللہ سے برابر ڈرتے رہو جہاں تک تم سے ہو سکے۔﴾

ایک اور مقام پر ہے:

وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا. (زمر:۷۳)

﴿اور جو لوگ اپنے پروردگار کے سامنے ہمیشہ خشوع کی حالت میں رہے ان کو گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔﴾

اس کی مثالیں بہت ہیں۔

۴۔ اس کا چوتھا پہلو مذکورہ بالا تینوں معانی کا جامع ہے یعنی گناہ سے اس کے برے نتائج اور خدا کے غضب کے ڈر سے بچتے رہنا، یہ لفظ جب مفعول کے بغیر آتا ہے تو اکثر یہ جامع مفہوم مراد ہوتا ہے اور اسی چیز کو تقویٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے:

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ. (نحل:۱۲۸)

﴿یقیناً اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے اور جو بہترین عمل کرنے والے ہیں۔﴾

ایک اور جگہ آیا ہے:

لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا أَجْرٌ عَظِيمٌ. (آل عمران:۱۷۲)

﴿ان میں سے جنہوں نے بہترین عمل کیے اور تقویٰ اختیار کیا ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے﴾

دوسری جگہ ہے:

وَإِنْ تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا فَلَكُمْ أَجْرٌ عَظِيمٌ. (آل عمران:۱۷۹)

﴿اور اگر تم ایمان لاؤ گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو تمہارے لیے بہت بڑا اجر ہے۔﴾

ایک اور مقام پر ہے:

وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ. (آل عمران:۱۸۶)

﴿اور اگر تم ثابت قدم رہے اور تقویٰ پر قائم رہے تو بے شک یہ عزیمت کی بات ہے۔﴾

نیز فرمایا ہے:

ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ. (انعام:۱۵۳)

﴿ان باتوں کی اس نے تم کو تاکید کی تاکہ متقی بنو۔﴾

اس معنی کے لحاظ سے متقی اسے کہیں گے جس کے دل میں خدا کی عظمت کا احساس، اس کے غضب کا خوف اور گناہوں کے برے انجام کا ڈر پوری طرح سما گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں متقین کی تعریف و تحسین بہت زیادہ کی گئی ہے اور سرکشوں اور مجرموں کے بالمقابل ان کو پیش کیا گیا ہے۔

قرآن مجید کبھی تو صرف اسی جامع لفظ کو لے کر آتا ہے اور کبھی اس کے معنی کی تفصیل کر دیتا ہے۔ اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس کے تینوں معنوی پہلو ایک ساتھ مراد ہوتے ہیں اور کبھی موقع کی مناسبت سے کوئی خاص پہلو اول درجہ میں اور بالذات مراد ہوتا ہے اور باقی پہلو ثانوی حیثیت سے آتے ہیں۔ مختلف پہلوؤں کے جامع الفاظ کے سمجھنے کے لیے یہ ایک بنیادی نکتہ ہے۔

جہاں تک اس لفظ کو اس کے جامع مفہوم میں استعمال کرنے کی بات ہے تو اس کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ جہاں جہاں اللہ تعالیٰ نے متقین کی تعریف کی ہے اور ان کے کسی خاص وصف کو بیان نہیں کیا ہے وہاں یہی صورت ہے۔

رہا مجملہ تمام پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو موقع کی مناسبت سے اجاگر کرنے کا معاملہ تو اس کی مثالیں بھی کم نہیں، جیسے:

أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ. (ص:۲۸)

﴿کیا ہم متقیوں کو فاجروں کی طرح کر دیں گے﴾

یعنی ان لوگوں کو جو خشیت الٰہی کے ساتھ گناہوں سے بچتے ہیں، کیوں کہ فجور کے معنی ہیں پوری دیدہ دلیری کے ساتھ گناہ کرنا۔

فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَىٰ. (لیل:۵۔۱۰)

﴿سو جس نے سخاوت کی اور ڈر ڈر کر چلا اور اچھے انجام کو سچ مانا اس کو ہم آسانی دیں گے آرام کی منزل تک پہنچنے کے لیے۔ اور جس نے بخالت کی اور بے پروا ہوا اور اچھے انجام کو جھٹلایا اس کو ہم آسانی دیں گے کٹھن منزل تک پہنچنے کے لیے۔﴾

دو طرح کے لوگوں سے متعلق یہ آیتیں ظاہر ہے کہ ایک دوسرے کے بالکل مقابل ہیں۔ یہاں 'اتقیٰ' کا لفظ 'استغنیٰ' کے مقابلہ میں آیا ہے چنانچہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کے سامنے رہتا ہو اور اس سے بے نیازی کا رویہ اختیار نہ کرے۔

اس لفظ کے جامع مفہوم کی تفصیل آیت ذیل میں بیان ہوئی ہے۔

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ...... اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ. (بقرہ:۱۷۷)

﴿خدا کے ساتھ وفاداری کی صورت یہ نہیں ہے کہ تم مشرق اور مغرب کی طرف رخ کرلو بلکہ وہی لوگ متقی ہیں﴾

'اولٰئک هم المتقون' سے پہلے ایمان اور اعمال صالح کی تفصیلات بیان کر کے بتادیا کہ متقی کہے جانے کے لائق صرف وہ لوگ ہیں جنہوں نے یہ صفات اپنے اندر جمع کرلی ہیں۔

چوں کہ اس لفظ کے مفہوم میں عمل کی بہ نسبت حال اور کیفیت کا پہلو اور فعل کے بالمقابل ترک کا پہلو زیادہ غالب اور نمایاں ہے اس لیے کبھی وہ تقابل کے طور پر فعل کے ساتھ آتا ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے:

لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا. (آل عمران:۱۷۲)

﴿ان میں سے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے خوبی کے ساتھ کام کیے اور ڈرتے رہے۔﴾

اور کبھی وضاحت کے طور پر ترک فعل کے ساتھ آتا ہے، جیسا کہ آیت ذیل میں ہے:

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا (آل عمران:۱۸۶)

﴿اور اگر تم ثابت قدم رہے اور ڈرتے رہے﴾

لیکن اس کے ساتھ چونکہ ایک قلبی حالت و کیفیت ہونے کی وجہ سے وہ تمام اعمال کا سرچشمہ بھی ہے، اس لیے جب ایمان کے ساتھ آتا ہے تو تقابل اور تفصیل دونوں ہی کے لیے آتا ہے، جیسا کہ اس آیت میں آپ دیکھ سکتے ہیں۔

وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا. (آل عمران:۱۷۹)

﴿اور اگر تم ایمان لائے اور خوف کھاتے رہے﴾

اس کی مثالیں بہت ہیں۔

نیز یہ علم کا بھی سرچشمہ ہے کیوں کہ یہ ایسا حال ہے جو قلب کی اصلاح کر دیتا ہے۔ تقویٰ کے وصف کی مزید تفصیل چودھویں اور پندرھویں فصل میں آئے گی۔

یُؤْمِنُوْنَ: ایمان کا لفظ حسب ذیل معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

۱۔ آمنہ: اس کو امن دیا۔

۲۔ آمن لہ: اس کا مطیع و منقاد ہوا۔

۳۔ آمن بہ: اس کی تصدیق کی، اس پر اعتماد کیا۔

جہاں تک اس ایمان کا تعلق ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک معتبر ہے تو اس کی تعریف و تفصیل قرآن مجید میں بہت سی جگہوں پر آئی ہے۔ سورہ عصر کی تفسیر میں ہم اس کو وضاحت کے ساتھ بیان کر چکے ہیں اور ایمان و ایقان کے درمیان جو معنوی فرق ہے اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

بالغیب: ۱۔ غیب کا لفظ مصدر ہے۔ غاب غیبا و غیبة و غیابا و غیوبا و مغیبا.

۲۔ اور اس چیز پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جو آپ کی نگاہوں سے اوجھل ہو۔ اس کا مقابل لفظ شہادت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ. (انعام:۷۳)

﴿وہ غائب و حاضر سب کا علم رکھنے والا ہے﴾

یعنی جو چیزیں ہماری نظروں سے اوجھل ہیں اور جو ہمارے سامنے ہیں ان سب کو جانتا ہے۔

۳۔ نیز ان امور کے لیے بھی آتا ہے جن کو جاننے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہ ہو، جیسا کہ قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کے قول کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا ہے:

وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ. (اعراف:۱۸۸)

﴿اگر میں غیب جانتا ہوتا تو خیر کا خزانہ جمع کر لیتا﴾

حاتم طائی کا شعر ہے:

اما والذی لا یعلم الغیب غیره ويحيى العظام البيض وهي رميم

(دیوان حاتم طائی:۱۸۴)

﴿اس ذات کی قسم جس کے سوا کسی کو غیب کا علم نہیں اور جو سفید، بوسیدہ ہڈیوں کو دوبارہ زندہ کرے گا﴾

۴۔ مزید براں اس لفظ کا استعمال اس جگہ کے لیے بھی ہوتا ہے جو آپ کے سامنے نہ ہو، اور اس سمت کے لیے بھی جو متعین نہ ہو رہی ہو، جیسا کہ عبدالشارق الجہنی کے اس شعر میں ہے:

سمعنا دعوة عن ظهر غيب فجلنا جولة ثم ارعوينا

(دیوان الحماسۃ بشرح المرزوقی:۴۴۶)

﴿کسی نامعلوم سمت سے ایک پکار سنائی دی تو ہم نے ایک چکر لگایا پھر اپنی جگہ پر لوٹ آئے﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

ذٰلِکَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْکَ وَمَا کُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْا اَمْرَهُمْ. (یوسف:۱۰۲)

﴿یہ سرگزشت غیب کی خبروں میں سے ہے جس کو ہم تمہاری طرف وحی کر رہے ہیں اور تم تو اس جگہ ان کے پاس موجود نہ تھے جب کہ انہوں نے اپنی رائے پختہ کی﴾

۵۔ اور راز کے معنی میں تو اس لفظ کا استعمال بہت ہی عام ہے، جیسا کہ فرمایا ہے:

حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ. (نساء:۳۴)

﴿رازوں کی حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں﴾

ایک اور جگہ آیا ہے:

فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖ اَحَدًا. (جن:۲۶)

﴿اور وہ اپنا راز کسی پر نہیں کھولتا﴾

اس لفظ کے یہی پانچ معروف استعمالات ہیں۔

یقیمون:

۱۔ اقام الشیء: کسی چیز کو کھڑا کرنا جیسے اقام العمود (اس نے کھمبے کو کھڑا کیا) اسی سے اقامۃ الحدود (حدود کو قائم کرنا) اور اقامۃ السوق (بازار لگانا) کے الفاظ بنے ہیں۔ یعنی معنوی اعتبار سے ان کو کھڑا کرنا۔

۲۔ کسی چیز کو اس طرح سیدھا کرنا کہ اس میں کوئی ٹیڑھ باقی نہ رہ جائے۔ اس کی مثالیں بہت ہیں۔

۳۔ سکونت اختیار کرنا، قیام کرنا، جیسے آپ کہتے ہیں: اقام ببلدۃ (اس نے ایک شہر میں قیام کیا) یہیں سے دام و بقی (مستقل قائم اور باقی رہنا) کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے:

فِیْهَا نَعِیْمٌ مُّقِیْمٌ. (توبہ:۲۱) ﴿جس میں ہمیشہ باقی رہنے والی نعمت ہے﴾

الصلاۃ: اس کے اصل معنی کسی چیز کی طرف بڑھنے، متوجہ ہونے اور قریب پہنچنے کے ہیں، یہیں سے رکوع کے معنی میں اور پھر تعظیم، تضرع اور دعا کے معنوں میں استعمال ہوا۔ یہ لفظ نماز اور عبادت کے معنی میں بہت قدیم ہے۔ کلدانی زبان میں دعا اور تضرع کے معنی میں نماز اور عبرانی میں نماز اور رکوع کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اسی اصل سے لغت میں صلی النار کا لفظ آتا ہے جس کے معنی آگ کی طرف بڑھنے اور قریب ہونے اور پھر اس میں داخل ہو جانے کے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا ہے:

سَیَصْلٰی نَارًا. (لہب:۳) ﴿وہ جلد آگ میں داخل ہوگا﴾

ایک اور جگہ ہے:

وَیَصْلٰی سَعِیْرًا. (انشقاق:۱۲) ﴿اور وہ دوزخ میں داخل ہوگا﴾

اسی سے "تصلیۃ" کا لفظ نکلا ہے۔ فرمایا:

وَ تَصْلِیَةُ جَحِیْمٍ. (واقعہ:۹۴) ﴿اور جہنم میں داخل کیا جاتا ہے﴾

عربوں نے ان تمام الفاظ کو استعمال کیا ہے۔

رزقناهم: رزق اس حصہ کو کہتے ہیں جو کسی کے پاس اس کے مالک کی طرف سے آتا ہے۔ اس کا فعل باب نصر سے ہے۔

ینفقون: نفق، نفد، نفذ سب کی اصل ایک ہے اور اس کے معنی جانے، چل پڑنے اور جاری ہونے کے ہیں۔ تیزی سے بکری یا خرید و فروخت ہونے کے لیے نفق البیع بولا جاتا ہے۔ نفق الزاد کے معنی ہیں سامان سفر ختم ہو گیا۔ انفق القوم کا مطلب ہے ان لوگوں کا کاروبار چل پڑا۔ انفق الرجل اس وقت بولتے ہیں جب آدمی کا مال چلا جائے یا خرچ ہو جائے۔ اسی مفہوم میں یہ آیت ہے:

اِذًا لَّاَمْسَکْتُمْ خَشْیَةَ الْاِنْفَاقِ. (بنی اسرائیل:۱۰۰)

﴿اس وقت تم خرچ ہو جانے کے اندیشہ سے ہاتھ روک لیتے﴾

"النفق" زمین کے اندر سرنگ کو کہتے ہیں۔ اسی سے "نافقاء" کا لفظ نکلا ہے جس کے معنی چوہے کی بل کے اس سرے کے ہیں جس میں داخلہ کے راستہ کو وہ چھپائے رہتا ہے اور اس کا دوسرا سرا "قاصعاء" کہلاتا ہے جسے وہ ظاہر کرتا ہے لیکن یہ اس کے مکان میں جانے کا راستہ نہیں ہوتا۔ اسی سے منافق لفظ بنا ہے۔

انفق المال کے معنی ہیں اس نے مال کا اجرا کیا، اسے باہر نکالا۔ نہ تو اسے روکا اور نہ اس کا راستہ بند کیا۔

الآخرۃ: ایک صفت ہے جو اسم بن گئی ہے اور دار آخرت کے معنی میں مستعمل ہے جس طرح دنیا کا لفظ اس دار کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ فرمایا ہے:

وَ اِنَّ الْاٰخِرَةَ هِیَ دَارُ الْقَرَارِ. (غافر:۳۹)

﴿اور یقیناً آخرت ہی اصل ٹھکانے کی جگہ ہے﴾

اس کی دوسری مثال ہے:

وَابْتَغِ بِمَا آتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا. (قصص: ۷۷)

﴿اور جو کچھ اللہ نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں دار آخرت کے طالب بنو اور دنیا میں سے اپنے حصہ کو نہ بھولو۔﴾

حیات اخروی پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ فرمایا ہے:

اِسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ (نحل: ۱۰۷)

﴿انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی پر ترجیح دی﴾

اس کی ایک اور مثال ہے:

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ. (یونس: ۶۴)

﴿ان کے لیے خوشخبری ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی﴾

نتیجہ کے اعتبار سے دونوں ایک ہی بات ہے۔ چنانچہ بعض وقت ذکر دار آخرت کا ہوتا ہے اور مراد اس سے دار آخرت کی زندگی ہوتی ہے جیسا کہ فرمایا ہے:

وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ. (عنکبوت: ۶۴)

﴿اور بے شک دار آخرت ہی اصل زندگی ہے﴾ یعنی دار آخرت کی زندگی ہی مکمل زندگی ہے۔

یوقنون: "ایقن بالشیء" کے معنی ہیں اس نے بغیر کسی شک وشبہ اس چیز کو جان لیا، جیسا کہ فرمایا ہے:

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ. لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ. (تکاثر: ۵-۷)

﴿ہرگز نہیں! اگر تم یقینی طور پر جانتے کہ تم ضرور دوزخ کو دیکھو گے، پھر اس کو تم یقین کی آنکھوں سے دیکھو گے﴾

ایمان اور ایقان کے مفہوم میں فرق یہ ہے کہ ایمان کے معنی تصدیق کرنے اور مان لینے کے ہیں۔ اس کی ضد تکذیب، انکار اور کفر ہے۔ اور ایقان کی ضد گمان اور شک ہے۔ ضروری نہیں کہ جو شخص یقین رکھتا ہو وہ تصدیق بھی کر دے بلکہ بسا اوقات آدمی کسی چیز پر یقین رکھنے کے باوجود سرکشی اور گھمنڈ کی وجہ سے اس کی تکذیب کر دیتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کے متعلق بیان فرمایا ہے:

فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ آيَاتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا. (نمل: ۱۳-۱۴)

﴿پس جب ان کے پاس ہماری آنکھیں کھول دینے والی نشانیاں آئیں تو انہوں نے کہا یہ تو کھلا ہوا جادو ہے اور انہوں نے ظلم اور گھمنڈ کے سبب سے ان کا انکار کر دیا حالانکہ ان کے دلوں نے ان پر یقین کیا تھا۔﴾

اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ جو شخص ایمان لایا ہو وہ یقین بھی رکھتا ہو۔ بعض وقت آدمی غلبہ ظن کی بنا پر ایمان لاتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اسے توفیق بخشتا ہے تو وہ گمان کے دائرہ سے باہر نکل آتا ہے لیکن ایمان بغیر ایقان کے مکمل نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایمان کے دو جزء ہیں: ایک علم یعنی جان لینا اور دوسرے اسے تسلیم کر لینا اور دونوں کے کمال ہی سے ایمان مکمل ہوتا ہے۔ اور جس شخص کا قلب درست ہو اس کے لیے محض جان لینا کافی ہوتا ہے اور اس علم ہی کے لحاظ سے اسے ماننے اور عمل کرنے کی توفیق ملتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ایقان ایمان کا علمی جزء ہے، لیکن علم کی صفت اس میں بمقابلہ ایمان کے زیادہ ہے۔ چوں کہ یہاں ایمان کے بعد اس کا ذکر آیا ہے اس لیے آخرت کے معاملہ میں وہ ایمان کے کمال پر دلالت کر رہا ہے۔

علی ھدی: یعنی "علی بصیرۃ" (وہ نور بصیرت پر ہیں) یا "علی صراط مستقیم" (وہ سیدھے راستے پر ہیں) دونوں ہی معنی لیے جا سکتے ہیں کیوں کہ حرف 'علی' دونوں پر آتا ہے۔ ان میں سے آپ جو بھی مراد لیں گے "علی" کے معنی اپنی جگہ پر باقی رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

قُلْ إِنِّي عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّي (انعام: ۵۷)

﴿کہہ دو میں اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہوں﴾

نیز فرمایا:

عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهِ. (زمر: ۲۲) ﴿اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر ہے﴾

اسی طرح یہ بھی آیا ہے:

إِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ. (حج: ۶۷) ﴿بے شک تم سیدھی راہ ہدایت پر ہو﴾

دوسری جگہ ہے:

إِنَّ رَبِّي عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ. (ھود: ۵۶) ﴿بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے﴾

جہاں تک حرف "علی" کے لفظ "صراط" پر داخل ہونے کا معاملہ ہے تو یہ بالکل ظاہر

ہے۔ البتہ نور، بینہ اور بصیرت پر آنے کی وجہ یہ ہے کہ نور جب پھیلتا ہے تو راستہ کو چلنے والوں کے لیے روشن کر دیتا ہے جس سے وہ اس پر چلتے ہیں۔ جب کہ تاریکی راستہ پر ہر طرف چھا جاتی ہے اور اسے ڈھانک لیتی ہے، چنانچہ چلنے والا بھی اسی میں چھپ جاتا ہے۔ دونوں کے اس فرق کی طرف ذیل کی آیت اشارہ کر رہی ہے:

وَ اِنَّا اَوْ اِیَّاکُمْ عَلٰی هُدًی اَوْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ. (سبا: ۲۴)

﴿اور ہم میں یا تم میں سے کوئی ایک ہدایت پر ہے یا کھلی ہوئی گمراہی میں﴾

المفلحون: افلح کے معنی فائز المرام ہونے کے ہیں جو کہ خسرو خاب یعنی گھاٹے میں ہونے اور نامراد ہونے کی ضد ہے، جیسا کہ اس آیت میں فرمایا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا. (شمس: ۹۔۱۰)

﴿فائز المرام ہوا جس نے اس کو پاک کیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو آلودہ کیا﴾

نیز فرمایا ہے:

اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (مجادلہ: ۲۲)

﴿سن لو، اللہ کی پارٹی ہی فلاح پانے والی ہے﴾

ایک اور جگہ ہے:

وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى. (طٰہٰ: ۶۴)

﴿آج کامیاب وہی ٹھہرے گا جو غالب آئے گا﴾

دوسرے مقام پر آیا ہے:

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ. (اعراف: ۸۔۹، مومنون: ۱۰۲۔۱۰۳)

﴿تو جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پانے والے بنیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی لوگ ایسے ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا ہے۔﴾

۲۔ کلام عرب میں یہ لفظ عاش بالنعمة (نعمتوں میں زندگی بسر کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے اور یہ قریب قریب ''فوز'' ہی کے ہم معنی ہے۔ اس مادہ کی اصل میں انشراح کا مفہوم پایا جاتا ہے چنانچہ اس سے فلج، فرج، فرح، فرق، فلق اور فلع کے الفاظ نکلے ہیں۔ عبرانی میں یہ مادہ موجود ہے، یہیں سے کھیت

جوتنے والے کے لیے فلاح کا لفظ نکلا ہے کیوں کہ وہ ہل چلانے میں مٹی کو پھاڑتا ہے۔ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے درمیان سلسلہ نسب میں ایک نام فالج آتا ہے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کا نام فالج اس وجہ سے پڑا کہ وہ زمین جوتنے کا کام کرتے تھے۔

۳۔ نیز کلام عرب میں یہ بقا کے معنی میں بھی آیا ہے۔

اس لفظ کے یہ تین معنوی پہلو ہیں اور ''المفلحون'' ان سب کا جامع ہے، کیوں کہ متقین ہی فائز المرام ہونے والے ہیں اور وہی ابدی نعمتوں میں عیش و آرام اور ہمیشگی کی زندگی گزارنے والے ہیں۔ متقین کے لیے یہ اوصاف اوائل وحی میں کثرت سے بیان ہوئے ہیں۔ اس جامع مفہوم پر ذیل کی آیات پوری طرح دلالت کر رہی ہیں۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ...... اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ. (مومنون: ۱۔۱۱)

﴿فائز المرام ہوئے وہ اہل ایمان جو اپنی نمازوں میں فروتنی اختیار کرنے والے ہیں ...... یہی لوگ وارث بننے والے ہیں جو کہ فردوس کے وارث ہوں گے۔ وہ اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔﴾

غور کیجیے کہ کس طرح ''افلح'' کے لفظ سے ان کا ذکر شروع کیا اور ختم اس بات پر کیا کہ وہ نعمتوں سے سرفراز ہونے والے، جنت کی وراثت پانے والے اور بقائے دوام حاصل کرنے والے ہیں۔

(جاری ہے)

مولانا امین احسن اصلاحی

درس صحیح بخاری

(کتاب المزارعۃ کی روایات)

باب:

❁ حدثنا قتیبة حدثنا اسمعیل بن جعفر عن موسی بن عقبة عن سالم بن عبدالله بن عمرؓ عن ابیه ان النبی ﷺ اری و هو فی معرسه من ذی الحلیفة فی بطن الوادی فقیل له انک ببطحاء مبارکة و قال موسیٰ و قد اناخ بنا سالم بالمناخ الذی کان عبدالله ینیخ به یتحری معرس رسول الله ﷺ وهو اسفل من المسجد ببطن الوادی بینه و بین الطریق وسط من ذالک.

ترجمہ:۔ سالم بن عبداللہ بن عمرؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ جب رات کو ذوالحلیفہ میں نالہ کے نشیب میں اترے تھے تو آپ سے خواب میں کہا گیا کہ تم برکت والے میدان میں ہو۔ موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں کہ سالم نے ہمارے ساتھ وہیں اونٹ بٹھایا جہاں عبداللہ بن عمرؓ بٹھایا کرتے تھے، وہ اسی جگہ کا قصد کررہے تھے جہاں آنحضرت ﷺ اترے تھے۔ یہ جگہ مسجد کے نیچے نالے کے نشیب میں تھی، اس کے اور راستے کے بیچ میں۔

وضاحت:۔ ذوالحلیفہ مدینہ کے لوگوں کے لیے میقات ہے جہاں سے وہ احرام باندھتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ جہاں اترے بلاشبہ وہ مبارک مقام ہے اور عبداللہ بن عمرؓ اس جگہ ٹھہرنے کے خواہش مند رہتے تھے تو یہ بھی متوقع ہے۔ یہ باتیں تو سب ٹھیک ہیں لیکن اس روایت کا یہاں محل کیا ہے؟ باب نیا ہے لیکن اس کا عنوان کوئی نہیں ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ امام بخاری جب اسی طریقہ سے بلاعنوان باب باندھتے ہیں تو سمجھنا چاہیے کہ روایت سابق باب ہی کا حصہ ہے۔ لیکن میں اپنا تجربہ بیان کرتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہیں۔ پچھلا باب تو غیر آباد زمین کے آباد کرنے کے بارے میں تھا لیکن اس باب کی روایت میں ایسی کوئی بات نہیں۔

بعض شارحین نے لکھا ہے کہ یہ حدیث لانے سے مقصد یہ ہے کہ ذوالحلیفہ کو اگر کوئی آباد کرنا چاہے تو وہ اس سے وہاں کی زمین پر اپنی ملکیت ثابت نہیں کرسکتا۔ اگر اس وضاحت سے باب سے تعلق آپ کی سمجھ میں آتا ہو تو آئے۔ لیکن میرے نزدیک ہر دو غیر متعلق چیزوں میں اس طرح کا کوئی نہ کوئی ربط

نکالنا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔

❁ حدثنا اسحٰق بن ابراهیم اخبرنا شعیب بن اسحٰق عن الاوزاعی قال حدثنی یحییٰ عن عکرمة عن ابن عباسؓ عن عمرؓ عن النبی ﷺ قال اللیلة اتانی ات من ربی وهو بالعقیق ان صل فی هذا الوادی المبارک و قل عمرة فی حجة

ترجمہ:۔ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ جب نبی ﷺ وادی عقیق میں تھے تو آپ نے فرمایا کہ شب میں اللہ کی طرف سے ایک آنے والا میرے پاس آیا۔ اس نے کہا اس وادی مبارک میں نماز پڑھیے اور نیت کیجیے کہ حج اور عمرہ دونوں ایک ساتھ ہوں۔

وضاحت:۔ یہ اوپر والی روایت کی تکمیل ہے اور اس میں رسول اللہ ﷺ کی رویا بھی بیان ہوئی ہے۔ یہ واقعہ حضورؐ کے حجۃ الوداع کا ہے۔ اس سفر میں آپ نے پہلے صرف حج کی نیت کی تھی لیکن اشارہ ہوا کہ اس سفر میں حج اور عمرہ دونوں کو جمع کریں۔ چنانچہ آپ نے حج قران کیا یعنی مدینے کر آپ نے عمرہ ادا کیا لیکن احرام نہیں کھولا اور اسی احرام سے حج بھی کیا۔ صحابہ کرامؓ کو آپ نے ہدایت فرمائی کہ وہ عمرہ کے بعد احرام کھول دیں اور حج کے لیے نیا احرام باندھیں یعنی ان کا حج تمتع کا حج ہو۔ اس پر لوگوں میں چہ میگوئیاں بھی ہوئیں لیکن آپ نے وضاحت فرمائی کہ میں چونکہ ہدی کے جانور مدینہ سے لے کر چلا تھا اس لیے میں عمرہ کے بعد احرام نہیں کھول سکتا۔

باب: اذا قال رب الارض اقرک ما اقرک الله و لم یذکر اجلا معلوما فهما تراضیهما.

باب: جب زمین کا مالک کاشتکار سے کہے کہ میں تمہیں اس پر مقرر کرتا ہوں جب تک کہ اللہ تعالیٰ تم کو رکھے اور کوئی مدت متعین نہ کرے تو فیصلہ اپنی باہمی رضامندی سے کرسکتے ہیں۔

❁ حدثنا احمد بن المقدام حدثنا فضیل بن سلیمان حدثنا موسیٰ اخبرنا نافع عن ابن عمرؓ قال کان رسول الله ﷺ ح وقال عبدالرزاق اخبرنا ابن جریج قال حدثنی موسی بن عقبه عن نافع عن ابن عمرؓ ان عمر بن الخطاب اجلی الیهود و النصری من ارض الحجاز و کان رسول الله ﷺ لما ظهر علی خیبر اراد اخراج الیهود منها و کانت الارض حین ظهر علیها لله ولرسوله ﷺ وللمسلمین و اراد اخراج الیهود منها فسالت

اليهود رسول الله ﷺ ليقرهم بها ان يكفوا حملها ولهم نصف الثمر فقال لهم رسول الله ﷺ نقركم بها على ذالک ما شئنا فقروا بها حتى اجلاهم عمرؓ الى تيماء و اريحآء.

ترجمہ:۔ عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے یہود و نصاریٰ کو ارض حجاز سے جلاوطن کیا۔ نبی ﷺ جب خیبر پر غالب آئے تو آپ نے چاہا کہ یہود کو وہاں سے نکال دیں اور وہ زمین جب اس پر غلبہ ہوا، اللہ، اس کے رسول ﷺ اور مسلمانوں کی ملکیت تھی۔ آپ نے چاہا کہ یہود کو وہاں سے نکال باہر کریں تو یہود نے درخواست کی کہ ان کو اس زمین پر اس شرط پر رہنے دیا جائے کہ وہ کھیتی باڑی کا کام کریں گے اور پیداوار کا نصف ان کو ملے گا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم تم کو اس کام پر رکھیں گے جب تک ہم چاہیں گے۔ تو یہود وہاں رہے یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے ان کو تیماء اور اریحاء کی طرف جلاوطن کر دیا۔

وضاحت:۔ اس روایت سے ایک بات تو یہ واضح ہوتی ہے کہ خیبر کی زمین کسی کی ذاتی ملکیت نہیں تھی بلکہ اللہ، اس کے رسول ﷺ اور مسلمانوں کی ملکیت تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ اسٹیٹ کی ملکیت تھی۔ اسی لیے حکومت کے تصرف سے آنحضرت ﷺ کی ازواج کو بھی پیداوار میں سے حصہ دیا جاتا تھا۔

امام صاحب نے باب تو یہ باندھا ہے کہ مالک زمین یہ کہے کہ میں تم کو مقرر رکھوں گا جب تک اللہ رکھے اور کسی مدت کا تعین نہ کرے لیکن روایت میں یہ ہے کہ ہم تم کو رکھیں گے جب تک ہم چاہیں گے۔ تو اس میں مدت کا تعین تو خود بخود ہو گیا کہ جب تک مسلمان چاہیں گے۔ میرے نزدیک عنوان باب اور روایت میں مطابقت نہیں ہے۔ بجائے خود یہ بات ٹھیک ہے کہ جب مدت معین نہ ہو تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ فیصلہ باہمی رضامندی سے ہو۔ اس میں کم از کم ایک سال کی مدت تو دینی ہوگی، اس لیے کہ فصل کے بیچ میں آپ کاشتکار کو ہٹا ئیں تو یہ قرین انصاف نہیں ہوگا۔ فصل کی تیاری کی مہلت دینی ہوگی۔

باب: ما كان فى اصحاب النبى ﷺ يواسى بعضهم بعضا فى الزراعة والثمر.

باب: آنحضرت ﷺ کے صحابہ کی کھیتی باڑی میں اور پھلوں میں ایک دوسرے سے موافقت کے بارے میں۔

❁ حدثنا محمد بن مقاتل اخبرنا عبدالله اخبرنا الاوزاعى عن ابى النجاشى مولى رافع بن خديج سمعت رافع بن خديج بن رافع عن عمه ظهير بن رافع قال ظهير لقد نهانا رسول الله ﷺ عن امر كان بنا رافقا قلت ما قال رسول الله ﷺ فهو حقٌ قال دعانى

رسول الله ﷺ قال ما تصنعون بمحا قلكم قلت نواجرها على الربيع و على الاوسق من التمر والشعير قال لا تفعلوا ازرعوها او ازرعوها او امسكوها قال رافع قلت سمعا وطاعة.

ترجمہ:۔ رافع بن خدیج اپنے چچا ظہیر بن رافع سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ہمیں ایک ایسے معاملہ سے روک دیا جو ہمارے لیے بہت نفع بخش تھا۔ میں نے کہا جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہی حق ہے۔ انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ تم لوگ اپنے کھیتوں کو کیا کرتے ہو۔ میں نے جواب دیا کہ ہم ان کو نہر کے کنارے کی پیداوار پر اور کھجور اور جو کے چند وسق پر دے دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ایسا نہ کیا کرو، خود کاشت کرو یا کاشت کراؤ یا روک رکھو۔ رافع نے کہا میں نے عرض کیا جو ارشاد، سنا اور مان لیا۔

وضاحت:۔ روایت میں نقل ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ظہیرؓ سے فرمایا لا تفعلوا ازرعوها او ازرعوها او امسكوها جس کے معنی ہیں تم ایسا نہ کرو، خود کاشت کرو یا کاشت کراؤ یا روک رکھو۔ تو یہ بیچ میں جو ازرعوها ہے یعنی کاشت کراؤ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس چیز سے روکا گیا تھا اس کا حکم ہو جائے گا۔ اصل میں اتنا ہی ہوگا کہ ازرعوها او امسكوها خود کاشت کرو یا خالی رکھو۔ اب یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ جو بیچ میں کاشت کرنے کا حکم آ گیا ہے تو یہ کیسے آیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مہاجرین کا پیشہ تجارت اور گلہ بانی تھا اور کھیتی باڑی سے ناواقف تھے۔ کھیتی انصار کا پیشہ تھا۔ یہاں مشکل یہ ہے کہ اس میں راوی بھی انصاری ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعد والے راویوں میں سے کسی کی غلطی سے کاشت کراؤ کا حکم بھی داخل ہو گیا۔ یا پھر اس پر کچھ شرائط کا اضافہ بھی رہا ہوگا جو روایت ہونے سے رہ گیا۔ اب اگر بات اتنی ہی ہو کہ خود کھیتی کرو یا روک رکھو تو مفہوم کی رو سے روایت ٹھیک ہے۔ وہ اس طرح کہ آنحضرت ﷺ کے پوچھنے پر کہ کھیتوں کا کیا کرتے ہو ظہیرؓ نے بتایا کہ نواجرها على الربيع و على الا وسق یعنی ان کو دے دیتے ہیں نہر کے کنارے کی پیداوار کے عوض اور کھجور اور جو کے کچھ وسق کے بدلے۔ یعنی انصار متعین رقبہ کی پیداوار اور متعین مقدار غلہ کے عوض کھیت دے دیتے تھے۔ تو اس صورت میں ضرر و غرر ہے اور اسلامی قانون کی رو سے یہ جائز نہیں ہے۔ اس میں مالک کا حصہ تو متعین ہو گیا لیکن کیا معلوم کہ مزارع کو نقصان ہو اور کچھ پیداوار ہی نہ ہو۔ بٹائی پر دینے کی صورت میں تو یہ ہوتا ہے کہ نصف یا چوتھائی یا ثلث پر مالک اور مزارع دونوں میں معاملہ طے پا جاتا ہے۔ اس طرح وہ نفع اور نقصان میں بھی برابر کے شریک ہو جاتے ہیں اور ضرر اور غرر کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ لیکن یہاں بیان کردہ صورت میں یہ اندیشہ ہے۔ اسی لیے حضور نے اس معاملہ سے روکا۔

۞ حدثنا عبیداللہ بن موسیٰ اخبرنا الاوزاعی عن عطاء عن جابرؓ قال کانوا یزرعونھا بالثلث والربع والنصف فقال النبی ﷺ من کانت لہ ارض فلیزرعھا او یمنحھا اخاہ فان لم یفعل فلیمسک ارضہ و قال الربیع بن نافع ابو توبۃ حدثنا معاویۃ عن یحییٰ عن ابی سلمۃ عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ من کانت لہ ارض فلیزرعھا او لیمنحھا اخاہ فان ابی فلیمسک ارضہ.

ترجمہ:۔ جابرؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم کھیتی کرتے تھے ثلث پر، ربع پر، اور نصف پر۔ پھر نبی ﷺ نے فرمایا کہ جس کے پاس کھیتی ہو چاہیے کہ خود کاشت کرے یا اپنے بھائی کو بخش دے اور اگر ایسا نہیں کرنا چاہتا تو اپنی زمین کو روک رکھے۔

وضاحت:۔ یہ روایت میری سمجھ سے باہر ہے۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ صحابہؓ نصف پر، چوتھائی، اور ثلث پر معاملہ کرتے رہے ہیں۔ اس سے منع نہیں کیا گیا۔ جس چیز سے روکا گیا ہے وہ اوپر والی روایت میں گزر چکا کہ رقبہ کے متعین حصہ پر اور متعین مقدار غلہ پر معاملہ نہیں ہو سکتا اس لیے کہ اس میں ضرر اور غرر ہے۔ ممکن ہے کہ حضرت جابرؓ بات کو پوری طرح نہ سمجھے ہوں یا بعد کے راویوں میں سے کسی نے روایت اس طرح کر دی ہو۔

۞ حدثنا قبیصۃ حدثنا سفیان عن عمرو قال ذکرتہ لطاؤس فقال یزرع قال ابن عباسؓ ان النبی ﷺ لم ینہ عنہ ولکن قال ان یمنح احدکم اخاہ خیر لہ من ان یاخذ شیئا معلوما.

ترجمہ:۔ عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ میں نے طاؤس سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا بٹائی پر زمین کاشت کروا سکتا ہے۔ ابن عباسؓ نے کہا آنحضرت ﷺ نے اس سے منع نہیں کیا، آپ نے یہ فرمایا کہ اگر تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو مفت کھیتی کرنے کو زمین دے تو یہ متعین چیز لینے سے بہتر ہے۔

وضاحت:۔ یہاں طاؤس ابن عباسؓ کا حوالہ دے رہے ہیں کہ جب جابرؓ کے قول کا ذکر ان کے سامنے ہوا تو انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے تو یہ فرمایا کہ آدمی کو چاہیے کہ یا تو خود کھیتی کرے یا دوسرے اپنے بھائی کو دے دے بطور احسان کے فضیلت کے طور پر۔ اس میں بٹائی کے معاملہ کی نفی نہیں تھی۔ اس لیے اس سے نہیں روکا تھا۔

۞ حدثنا سلیمان بن حرب حدثنا حماد بن ایوب عن نافع عن ابن عمرؓ کان یکری مزارعہ علی عھد النبی ﷺ و ابی بکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و صدرا من امارۃ معاویۃ ثم

حدث عن رافع بن خدیج ان النبی ﷺ نھی عن کراء المزارع فذھب ابن عمرؓ الی رافع فذھبت معہ فسالہ فقال نھی النبی ﷺ عن کراء المزارع فقال ابن عمرؓ قد علمت انا کنا نکری مزارعنا علی عھد رسول اللہ ﷺ بما علی الاربعاء و بشیء من التبن.

ترجمہ:۔ نافع کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرؓ اپنے کھیتوں کو آنحضرت ﷺ، ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کے ادوار اور معاویہؓ کی خلافت کے ابتدائی دور تک کرایہ پر دیا کرتے تھے۔ پھر ان کو رافع بن خدیجؓ کی بات سنائی گئی کہ آنحضرت ﷺ نے کھیتوں کو کرایہ پر دینے سے منع فرمایا ہے۔ تو وہ خود رافع کے پاس گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ گیا۔ انہوں نے ان سے پوچھا تو رافع نے کہا آنحضرت ﷺ نے کھیتوں کو کرایہ پر دینے سے منع فرمایا ہے۔ ابن عمرؓ نے کہا تم جانتے ہو کہ ہم آنحضرت ﷺ کے زمانے میں اپنے کھیت اس پیداوار کے بدلے جو نہر کے کناروں پر ہوتی تھی اور تھوڑی گھاس کے بدل دے دیا کرتے تھے۔

۞ حدثنا یحییٰ بن بکیر حدثنا اللیث عن عقیل عن ابن شھاب اخبرنی سالم ان عبداللہ بن عمرؓ قال کنت اعلم فی عھد رسول اللہ ﷺ ان الارض تکری ثم خشی عبداللہ ان یکون النبی ﷺ قد احدث فی ذالک شیاء لم یکن یعلمہ فترک کراء الارض.

ترجمہ:۔ سالم کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں زمین بٹائی پر دی جاتی تھی۔ پھر عبداللہ ڈرے کہ ایسا نہ ہو کہ آنحضرت ﷺ نے کوئی نیا حکم دیا ہو جس کی ان کو خبر نہ ہو اس لیے انہوں نے زمین کرایہ پر دینا ترک کر دیا۔

وضاحت:۔ پیچھے جو روایات گزری ہیں ان سے متعین طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جس بات کی ممانعت کی گئی تھی وہ یہ تھی کہ زمین کے مالک ایک خاص رقبہ کی پیداوار یا ایک متعین حصہ کے عوض زمین کرایہ پر دیا کرتے تھے۔ اس میں قباحت یہ تھی کہ مالک تو پورا پورا معاوضہ وصول کر لیتا لیکن کاشت کرنے والا غیر یقینی صورت حال سے دوچار ہوتا۔ اگر کھیت کو پانی مل جاتا اور کاشتکار کے رقبہ میں اچھی فصل ہو جاتی تو وہ اپنی محنت کی قیمت وصول کر لیتا ورنہ نقصان میں رہتا۔ بٹائی کے معاملہ میں یہ قباحت دور ہو جاتی ہے کیونکہ مالک اور کاشتکار دونوں کثرت پیداوار کے فوائد سے بھی متمتع ہوتے ہیں اور اگر نقصان ہو تو وہ بھی دونوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

عبداللہ بن عمرؓ ایک پرہیزگار شخص تھے۔ ایک طویل مدت تک ان کا عمل جس بات پر رہا اس

کے بارے میں معلوم ہوتا ہے انہیں شبہ لاحق ہو گیا۔ اور وہ عمل خاص رقبہ کی پیداوار کاشتکار کو دینے کا تھا، جیسا کہ سلیمان بن حرب کی روایت میں بیان ہوا ہے۔ چنانچہ ابن عمرؓ نے رافع بن خدیجؓ کی معلومات پر عمل کیا اور احتیاط کے خیال سے زمین کرایہ پر دینا ہی ترک کر دیا۔

باب: کرآء الارض بالذهب والفضة وقال ابن عباسؓ ان امثل ما انتم صانعون ان تستاجروا الارض البیضاء من السنة الی السنة.

باب: سونے چاندی کے بدل زمین دینے کے بارے میں اور ابن عباس نے کہا کہ

بہتر کام جو تم کرنا چاہو یہ ہے کہ خالی زمین ایک ایک سال کے لیے کرایہ پر دو۔

یہاں امام صاحب نے حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ بہترین عمل ایک سال کے لیے زمین کاشت کے لیے کرایہ پر دینا ہے۔ اگرچہ مالک کے نقطہ نظر سے سہولت اسی میں ہے کہ وہ ایک سال کے لیے زمین پٹہ پر دے دے لیکن عملاً دیکھا گیا ہے کہ اس میں کاشتکار بڑے نقصان سے بھی دوچار ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس کو ضرر سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ اس صورت میں مالک اس کے نقصان میں حصہ دار بنے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ پٹہ کی مدت ایک سال کے بجائے دو یا تین سال رکھی جائے تاکہ نقصان کی صورت میں اس کی تلافی ہو سکے۔

❁ حدثنا عمرو بن خالد حدثنا اللیث عن ربیعة بن ابی عبدالرحمن عن حنظلة بن قیس عن رافع بن خدیج قال حدثنی عمای انهم کانوا یکرون الارض علی عهد النبی ﷺ بما ینبت علی الاربعاء او شیء یستثنیه صاحب الارض فنهی النبی ﷺ عن ذالک فقلت لرافع فکیف هی بالدینار والدرهم فقال رافع لیس بها باس بالدینار والدرهم و قال اللیث و کان الذی نهی عن ذالک مالو نظر فیه ذوالفهم بالحلال والحرام لم یجیزوه لما فیه من المخاطرة.

ترجمہ:۔ رافع بن خدیجؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے میرے دونوں چچاؤں نے بیان کیا کہ وہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں زمین کو اس پیداوار کے بدل دیا کرتے تھے جو نہر کے کناروں پر ہوتی تھی یا جس پیداوار کو زمین کا مالک مستثنیٰ کر دے۔ آنحضرت ﷺ نے اس سے منع کیا۔ حنظلہ کہتے ہیں کہ میں نے رافع سے پوچھا دینار و درہم کے عوض کرایہ پر دینا کیسا ہے۔ رافع نے کہا دینار و درہم کے بدل دینے میں قباحت نہیں۔ اور لیث کہتے ہیں جس بٹائی سے منع فرمایا ہے اگر اس میں حرام حلال سمجھنے والا غور

کرے تو اس کو جائز نہیں کہے گا کیونکہ اس میں دھوکا ہے۔

وضاحت:۔ روایت کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔ اس میں رافع کا فتویٰ بیان ہوا ہے کہ نقدی کے عوض زمین کرایہ پر لینا دینا جائز ہے۔

گویا پٹہ پر زمین لینے دینے کی مروجہ صورت صحیح ہے اور اس کے غلط ہونے کی بظاہر کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی۔ حنظلہ نے جس بٹائی کو حرام قرار دیا ہے وہ وہی ہے جس میں کسی خاص رقبہ کی پیداوار کو کاشتکار کا حصہ نامزد کر دیا جاتا ہے۔ اس میں ضرر اور غرر دونوں کی قباحت پائی جاتی ہے۔

باب:

❁ حدثنا محمد بن سنان حدثنا فلیح حدثنا هلال و حدثنا عبدالله بن محمد حدثنا ابو عامر حدثنا فلیح عن هلال بن علی عن عطاء بن یسار عن ابی هریرةؓ ان النبی ﷺ کان یوما یحدث و عنده رجل من اهل البادیة ان رجلا من اهل الجنة استاذن ربه فی الزرع فقال له الست فیما شئت قال بلی ولکنی احب ان ازرع فبذر فبادر الطرف نباته واستواؤه و استحصاده فکان امثال الجبال فیقول الله دونک یا ابن ادم فانه لا یشبعک شیء فقال الاعرابی والله لا تجده الا قریشا او انصاریا فانهم اصحاب زرع و اما نحن فلسنا باصحاب زرع فضحک النبی ﷺ.

ترجمہ:۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی ﷺ کے پاس ایک دیہاتی بیٹھا تھا اور آپ یہ گفتگو فرما رہے تھے کہ جنت والوں میں سے ایک شخص اللہ تعالیٰ سے کھیتی کرنے کی اجازت مانگے گا۔ اللہ پوچھے گا تو جو چاہتا ہے کیا وہ تیرے پاس نہیں، وہ کہے گا بے شک ہے، لیکن کھیتی کرنا مجھ کو پسند ہے۔ وہ بیج ڈالے گا تو پلک جھپکنے میں وہ اگ آئے گا، سیدھا ہو جائے گا اور کاٹنے کے لائق ہو جائے گا۔ بالکل پہاڑوں کی مانند۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا لے اے آدم کے بیٹے تیرا پیٹ بھرنے والا نہیں۔ یہ سن کر دیہاتی کہنے لگا کہ آپ کو یہ شخص یا قریشی ملے گا یا انصاری کہ وہی کھیتی کرتے ہیں، ہم تو کھیتی باڑی کے لوگ نہیں ہیں۔ یہ سن کر آنحضرت ﷺ ہنس دیے۔

وضاحت:۔ اس حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ نے قرآن مجید کی اس خبر کی وضاحت فرمائی ہے کہ اہل جنت کو جنت میں ان کی ہر خواہش کو پورا کرنے کا موقع دیا جائے گا اور جو مطالبہ بھی وہ کریں گے اس کو پورا کیا جائے گا۔ آپ کے پاس ایک دیہاتی بیٹھا تھا۔ شاید اس کو بات سمجھانے کی غرض سے آپ نے بتایا

کہ اگر کوئی شخص کھیتی کرنے کی خواہش بھی کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس خواہش کو بھی پورا کرے گا۔ لیکن جنت کی کاشتکاری کے نتائج حاصل کرنے میں دیر نہیں لگے گی بلکہ دیکھتے ہی دیکھتے فصل تیار ہو کر کاٹنے کے قابل ہو جائے گی۔ دیہاتی بھی کوئی ظریف آدمی تھا۔ کہنے لگا کہ جنتی، جو زراعت کی خواہش کریں گے، قریش یا انصاری میں سے ہو سکتے ہیں کیونکہ مدینہ میں کھیتی باڑی میں یہی دونوں مشغول رہتے تھے۔ ہم دیہاتیوں کا تو زراعت سے کوئی تعلق نہیں۔ نبی ﷺ اس لطیفہ سے محظوظ ہوئے۔

امام صاحب نے اس حدیث کے عنوان کی عبارت نہیں لکھی۔ لیکن اس کا تعلق پچھلے باب کی روایات کے ساتھ نہیں ہے۔ اس لیے ان شارحین کا نقطہ نظر صحیح نہیں معلوم ہوتا جو اس طرح کے ابواب کو سابق باب کا تسلسل مانتے ہیں۔

باب: ما جاء من الغرس

باب: درخت بونے کے بارے میں روایات

❁ حدثنا قتيبة بن سعيد حدثنا يعقوب عن ابی حازم عن سهل بن سعدؓ انه قال انا كنا لنفرح بيوم الجمعة كانت لنا عجوز تاخذ من اصول سلق لنا كنا نغرسه فی اربعآئنا فتجعله فی قدر لها فتجعل فيه حبات من شعير لا اعلم الا انه قال شحم و لا ودک فاذا صلينا الجمعة زرنا ها فقربته الينا فكنا نفرح بيوم الجمعة من اجل ذالک وما كنا نتغدى ولا نقيل الا بعد الجمعة.

ترجمہ:۔ ابوحازم، سہل بن سعد سے بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ ہم کو جمعہ کے دن خوشی ہوا کرتی تھی۔ ہماری ایک بڑھیا تھی جو چقندر کی جڑیں لیتی، جس کو ہم کھیتوں میں نالیوں کے کنارے بویا کرتے تھے۔ وہ ایک ہانڈی میں ان کو پکاتی۔ اوپر سے تھوڑے دانے جو کے ڈال دیتی۔ ابوحازم کہتے ہیں کہ میں یہی جانتا ہوں کہ سہل نے کہا کہ اس میں چربی ہوتی تھی نہ چکنائی۔ جب ہم نماز جمعہ پڑھ کر اس کے پاس جاتے تو وہ ہمارے سامنے یہ کھانا لاتی۔ اس کھانے کے باعث ہم کو جمعہ کی خوشی ہوا کرتی اور ہم جمعہ کی نماز کے بعد ہی کھانا کھاتے اور سوتے تھے۔

وضاحت:۔ اس روایت میں ایک صحابی کا قول اور عمل بیان ہوا ہے۔ یہ اصطلاحی معنی میں حدیث نہیں ہے۔ شجرکاری ہمیشہ سے انسان کا ایک محبوب مشغلہ رہی ہے۔ طرح طرح کی فصلیں بوئی جاتی ہیں۔ کسان کھیتوں کے کناروں پر درخت لگاتے ہیں۔ کھیتوں کے اندر علاقہ کی فصل کاشت کی جاتی ہے۔ کھیت میں

پانی پہنچانے کے لیے نالیاں بنائی جاتی ہیں۔ ان نالیوں کے اردگرد کی زمین چونکہ اکثر سیراب رہتی ہے اس لیے موزوں سبزیاں اور پودے نالیوں کے کناروں پر لگا دیے جاتے ہیں۔ اسی طرح کے کسی کھیت میں نالیوں کے کنارے چقندر کاشت کی جاتی تھی تو سہل بن سعدؓ کے خاندان کی کوئی بزرگ خاتون ان کی مہمان داری کے لیے جمعہ کے روز چقندر کی جڑوں کا سالن پکا کر ان کو کھلاتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سالن ان کو بہت مرغوب تھا اس لیے جمعہ کا روز اس خاص ڈش کے باعث ان کے لیے بے حد پر مسرت ہوتا۔

❁ حدثنا موسیٰ بن اسماعیل حدثنا ابراهيم بن سعد عن ابن شهاب عن الاعرج عن ابی هريرة قال يقولون ان اباهريرةؓ يكثر الحديث والله الموعد و يقولون ما للمهاجرين والانصار لا يحدثون مثل احاديثه و ان اخوتی من المهاجرين كان يشغلهم الصفق بالاسواق و ان اخوتی من الانصار كان يشغلهم عمل اموالهم و كنت امرأ مسكينا الزم رسول الله ﷺ علی مل ء بطنی فاحضر حين يغيبون و اعی حين ينسون و قال النبی ﷺ يو مالن يبسط احد منكم ثوبه حتی اقضی مقالتی هذه ثم يجمعه الی صدره فينسی من مقالتی شيئا ابدا فبسطت نمرة ليس علی ثوب غيرها حتی قضی النبی ﷺ مقالته ثم جمعتها الی صدری فوالذی بعثه بالحق ما نسيت من مقالته تلک الی يوم هذا والله لو لا ايتان من كتاب الله ما حدثتكم شيئا ابدا ان الذين يكتمون ما انزلنا من البينت الی قوله الرحيم.

ترجمہ:۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ابوہریرہؓ بہت حدیثیں بیان کرتا ہے۔ آخر اللہ تعالیٰ سے مجھے ملنا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دوسرے مہاجرین اور انصار ابوہریرہؓ کی طرح حدیثیں کیوں بیان نہیں کرتے۔ بات یہ ہے کہ میرے مہاجر بھائی بازاروں میں کاروبار میں مشغول رہتے تھے اور میرے انصار بھائی اپنے مویشیوں کی ذمہ داریوں میں لگے رہتے تھے جبکہ میں ایک قلاش آدمی تھا۔ پیٹ بھر جاتا تو میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ رہتا تھا۔ جب یہ لوگ غائب ہوتے تھے تو میں موجود رہتا۔ میں یاد رکھتا تھا جب کہ یہ لوگ بھول جاتے تھے۔ ایک دن آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے جو کوئی اپنا کپڑا اس وقت پھیلائے رکھے جب تک میں اپنی گفتگو ختم کروں، پھر اس کو سمیٹ کر اپنے سینے سے لگا لے تو وہ میری اس گفتگو کو کبھی نہیں بھولے گا۔ یہ سن کر میں نے اپنی چادر بچھا دی، بس وہی چادر میرے پاس تھی اور کوئی کپڑا نہ تھا۔ یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی تقریر ختم کی۔ پھر میں نے اس کو سمیٹ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ قسم اس کی جس نے آنحضرت ﷺ کو سچائی کے ساتھ بھیجا میں آپ کی اس تقریر سے

کوئی بات آج تک نہیں بھولا۔ اور قسم اللہ کی اگر قرآن کی یہ دو آیتیں نہ ہوتیں ان الذین یکتمون سے الرحیم تک، تو میں تم سے کبھی کوئی حدیث نہ بیان کرتا۔

وضاحت:۔ یہ روایت تقریباً انہی الفاظ میں جلد اول کے صفحہ ۳۴۳ پر کتاب البیوع کے پہلے باب کی پہلی حدیث کے طور پر گزر چکی ہے۔ اس کی تشریح وہاں ملاحظہ کی جائے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ تجارت اور کھیتی باڑی اور مویشیوں کی مشغولیت میں تحصیل علم سے غفلت ہو جاتی ہے۔ علم ان چیزوں کی قربانی چاہتا ہے۔ ابوہریرہؓ نے شب و روز رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وابستہ رہ کر علم حاصل کیا اور صرف پیٹ بھر لینے ہی پر قانع رہے تو حدیث کے سب سے زیادہ روایت کرنے والے بن گئے۔ دوسرے صحابہ جن کے دنیاوی مشاغل بھی تھے وہ علم میں ابوہریرہؓ سے پیچھے رہ گئے۔

امام صاحب یہ روایت غرس یعنی درخت لگانے کے باب میں لائے ہیں۔ یہ مفہوم انہوں نے عمل اموالھم کے الفاظ سے اخذ کیا ہے۔ میرے نزدیک اموال کا غالب اطلاق مویشیوں پر ہوتا ہے جو عربوں کی اصل دولت تھی۔ قابل کاشت زمینیں بہت کم تھیں۔ ہمارے ہاں بھی مال مویشی اسی مفہوم میں کہا جاتا ہے۔ لہٰذا عمل اموال کا غالب مفہوم مویشیوں کی دیکھ بھال اور ذمہ داریاں ادا کرنا تھا۔ تاہم انصار چونکہ نخلستان کے علاقہ میں آباد تھے اس لیے باغات کی دیکھ بھال کا کام بھی عمل اموال میں شمار ہوگا۔

حضرت ابوہریرہؓ نے حدیث کی روایت کے ضمن میں جن آیات کا حوالہ دیا ہے وہ سورہ بقرہ کی یہ آیات ہیں:

ان الذین یکتمون .... التواب الرحیم (بقرہ:۱۵۹۔۱۶۰)

﴿بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں ہماری اتاری ہوئی کھلی کھلی نشانیوں اور ہماری ہدایت کو، بعد اس کے کہ ہم نے وہ کتاب میں کھول کر لوگوں کے لیے بیان کر دی تھیں، تو وہی لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور جن پر لعنت کرنے والے لعنت کریں گے۔ البتہ جن لوگوں نے توبہ کر لی اور اصلاح کر لی اور واضح طور پر بیان کر دیا تو ان کی توبہ میں قبول کروں گا اور میں بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہوں۔﴾

اصلاً یہ آیات توریت میں نازل شدہ احکام کے ضمن میں آئی ہیں جن کو یہود لوگوں سے پوشیدہ رکھتے تھے۔ اس پر ان کو لعنت کا مستحق بتایا ہے۔

(ترتیب: سید اسحاق علی)

امین احسن اصلاحی

درس موطا امام مالکؒ

کتاب جامع الوضوکی روایات

(۷) بابُ مَاجَاءَ فِي المَسحِ بِالرَّأسِ وَالاُذُنَينِ

وہ روایات جو سر اور کانوں کے مسح کے بارے میں ہیں

۱۔ حَدَّثَنِي يَحيٰى عَن مَالِكٍ عَن نَافِعٍ اَنَّ عَبدَاللّٰهِ بنَ عُمَرَ كَانَ يَاخُذُ المَاءَ بِاَصبَعَيهِ لِاُذُنَيهِ.

ترجمہ:۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ اپنی دونوں انگلیوں سے اپنے کانوں (کے مسح) کے لیے پانی لیتے تھے۔

وضاحت:۔ مطلب یہ ہے کہ وہ از سر نو پانی لے کر کانوں کا مسح کرتے تھے۔

۲۔ وحَدَّثَنِي يَحيٰى عَن مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ جَابِرَ بنَ عَبدِاللّٰهِ الاَنصَارِيَّ سُئِلَ عَنِ المَسحِ عَلَى العِمَامَةِ فَقَالَ: لَا. حَتّٰى يُمسَحَ الشَّعرُ بِالمَاءِ.

ترجمہ:۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے عمامہ پر مسح کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا نہیں، جب تک پانی سے بال کا مسح نہ ہو جائے۔

وضاحت:۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک پانی سے بالوں کا مسح نہ ہو جائے اس وقت تک عمامہ پر مسح معتبر نہیں ہے۔ گویا کہ بالوں پر بھی مسح کیا جائے گا تب عمامہ پر مسح ہو سکتا ہے۔

۳۔ وَحَدَّثَنِي عَن مَالِكٍ عَن هِشَامِ بنِ عُروَةَ اَنَّ اَبَاهُ عُروَةَ بنَ الزُّبَيرِ كَانَ يَنزِعُ العِمَامَةَ وَيَمسَحُ رَاسَهُ بِالمَاءِ.

ترجمہ:۔ حضرت عروہ بن زبیرؓ کے متعلق روایت ہے کہ وہ اپنا عمامہ اتار لیتے تھے اور اپنے سر کا پانی سے مسح کرتے تھے۔

وضاحت:۔ یعنی وہ اپنا عمامہ اتارنے کے بعد باقاعدہ پانی سے سر کا مسح کیا کرتے تھے۔

۴۔ وحدثنی عن مالک عن نافع انہ' راٰ صفیۃ بنت ابی عبید امراۃ عبداللہ بن عمر تنزع خمارھا و تمسح علی راسھا بالماء. ونافع'' یومئذ صغیر''۔

ترجمہ:۔ نافعؒ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی زوجہ محترمہ صفیہ بنت ابوعبیدؒ کو دیکھا کہ وہ اپنی اوڑھنی اتار لیتی تھیں اور اپنے سر پر پانی سے مسح کرتی تھیں اور نافع اس وقت چھوٹے تھے۔

وضاحت:۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی زوجہ محترمہ بھی وضو کے دوران اپنی اوڑھنی اتار کر اپنے سر پر پانی سے مسح کرتی تھیں۔

امام مالکؒ کے فتوے:

۔ امام مالکؒ سے عمامہ اور اوڑھنی پر مسح سے متعلق فتویٰ پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ جائز نہیں ہے کہ مرد حضرات اپنے عمامہ پر اور خواتین اپنی اوڑھنی پر مسح کریں۔ جائز شکل یہ ہے کہ وہ عمامہ اور اوڑھنی اتار کر سر کے بالوں پر مسح کیا کریں۔

۔ امام مالکؒ سے ایک ایسے شخص کے متعلق فتویٰ پوچھا گیا جس نے وضو کیا لیکن اپنے سر پر مسح کرنا بھول گیا یہاں تک کہ اس کا وضو خشک ہو گیا تو انہوں نے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ وہ سر پر مسح کرے اور اگر نماز پڑھ لی ہے تو وہ نماز کا اعادہ کرے۔

یہ اس باب کی جملہ حدیثیں ہیں لیکن حنفیہ ان چیزوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ وہ صحیح مسلم کی اس روایت کی بنا پر کہ نبی ﷺ نے پیشانی پر مسح کیا اور اس کے بعد عمامے پر سر کا مسح کیا اسی عمل کو اہمیت دیتے اور کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا روایتوں میں سے کوئی روایت اس روایت کے برابر نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب تو آثار صحابہ ہیں، کوئی مرفوع حدیث نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ موطا کے راوی وہ ہیں جو اپنے تقشف اور احتیاط میں مشہور ہیں۔ ان میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہیں جو اس معاملے میں نمایاں شہرت رکھتے ہیں۔ دوسری ان کی زوجہ محترمہ ہیں جو بہرحال اپنے شوہر ہی کا اتباع کریں گی اور دوسرے لوگوں کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

صحیح مسلم کی روایت جس پر حنفیہ کا اعتماد ہے یوں ہے:

وَقَدْ سَمِعْتُ مِنِ ابْنِ الْمُغِيرَةِ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَوَضَّأَ فَمَسَحَ بِنَاصِيَتِهِ وَعَلَى الْعِمَامَةِ وَ عَلَى الْخُفَّيْنِ. (صحیح مسلم: کتاب الطہارۃ۔ باب ۲۳)

ابن مغیرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے وضو کیا تو اپنی پیشانی اور عمامہ پر اور موزوں پر مسح کیا۔

یہ روایت مرفوع ہے۔ یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ یہ عقلی بھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب سر پر عمامہ ہو تو شریعت اسلامی کا تقاضا تو یہی ہے کہ رفع زحمت کے لیے اس کے اوپر بھی مسح کی اجازت حاصل ہو۔ میں اس معاملے میں حنفیہ کے مسلک کو ترجیح دیتا ہوں۔ صرف عقلی ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ روایت مرفوع کے ہونے کی بنا پر، اس لیے کہ آثار صحابہ کے بالمقابل کوئی وجہ نہیں کہ روایت مرفوع کو ترجیح نہ دی جائے۔

اس عمل کی تائید مزید دوسری رخصتوں سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً اس روایت میں بھی ہے اور آگے مسح علی الخفین کی روایات بھی آ رہی ہیں کہ نبی ﷺ نے خف (موزہ) کے اوپر بھی مسح فرمایا۔ اسی طرح تیمم کی اجازت بھی رفع زحمت کے لیے ہے۔ واقع یہ ہے کہ ہمارے فقہاء عام طور پر اس کی علت نہیں متعین کر پاتے۔ شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کے نزدیک بھی دین کی بڑی آفتوں میں سے یہ ہے کہ ہمارے عام فقہاء کو دین میں علت متعین کرنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ بعض اوقات علت غیر عقلی متعین کر بیٹھتے ہیں۔ فوجیوں کو جوتے پر مسح کی اجازت ہے لیکن دوسرے اپنے موزے پر مسح نہیں کر سکتے۔

آنحضرت ﷺ نے پیشانی سے عمامے پر مسح کیا۔ اس صاف بات میں بھی حنفیہ ایک بے تکی بات کہہ دیتے ہیں۔ چونکہ ان کے ہاں ربع سر کا مسح ضروری ہے تو انہوں نے کہا کہ مسح پیشانی کے اوپر کر کے عمامے کے اوپر ہو سکتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ پیشانی چہرے میں شامل ہے، سر میں تو شامل نہیں۔ سر وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں سے بال شروع ہوتے ہیں۔ یہ اتفاقی واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مسح پیشانی سے کیا۔ میرے نزدیک پیشانی کی قید بھی غیر ضروری ہے اس لیے کہ علت درحقیقت وہی ہے، یعنی رفع زحمت۔

(۸) بَابُ مَاجَاءَ فِي الْمَسْحِ عَلَى الْخُفَّيْنِ

باب: وہ روایات جو موزوں پر مسح کے بارے میں ہیں

۱۔ حدثنی یحیی عن مالک عن ابن شہاب عن عباد بن زیاد من ولد المغیرۃ بن شعبۃ عن ابیہ عن المغیرۃ بن شعبۃ ان رسول اللہ ﷺ ذھب لحاجتہ فی غزوۃ تبوک. قال المغیرۃ: فذھبت معہ بماء فجاء رسول اللہ ﷺ فسکبت علیہ الماء فغسل وجھہ ثم ذھب یخرج یدیہ من کمی جبتہ فلم یستطع من ضیق کمی الجبۃ. فاخرجھما من تحت الجبۃ. فغسل یدیہ و مسح براسہ و مسح علی الخفین فجاء رسول اللہ ﷺ وعبد الرحمن بن عوف یؤمھم وقد صلی بھم رکعۃ فصلی رسول اللہ ﷺ الرکعۃ التی بقیت علیھم ففزع الناس. فلما قضی رسول اللہ ﷺ قال احسنتم.

ترجمہ:۔ مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے کہ غزوہ تبوک کے موقع پر رسول اللہ ﷺ قضائے حاجت کے لیے تشریف لے گئے۔ مغیرہ نے کہا کہ میں پانی لے کر آپ کے ساتھ گیا۔ جب رسول اللہ ﷺ ضرورت سے فارغ ہو کر واپس آئے تو میں نے آپ کے اوپر (وضو کے لیے) پانی گرایا۔ آپ نے اپنا منہ دھویا، پھر آپ لگے نکالنے اپنے ہاتھ اپنے جبہ کی آستینوں سے، لیکن جبہ کی آستین کی تنگی کی وجہ سے آپ ایسا نہ کر سکے۔ پھر آپ نے ان کو جبہ کے نیچے سے نکال لیا۔ پھر آپ نے اپنے ہاتھ دھوئے اور اپنے پورے سر کا مسح کیا اور موزوں پر مسح کیا۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو عبدالرحمٰن بن عوفؓ لوگوں کی امامت کر رہے تھے اور وہ ان کے ساتھ ایک رکعت نماز پڑھ چکے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کے ہمراہ وہ رکعت پڑھی جو کہ باقی رہ گئی تھی۔ (جب لوگوں کی نظر پڑی تو) لوگ گھبرائے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی نماز پوری کر لی تو ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں نے بہت اچھا کیا۔

وضاحت:۔ من ولد المغیرة یعنی مغیرہ کی اولاد میں سے۔ ولد کا لفظ واحد جمع سب کے لیے آتا ہے۔

فَلَمْ يَسْتَطِعْ: یعنی جس طرح معمول کے مطابق آستین سے بازو نکالنا ہوتا ہے اس طرح آستین تنگ ہونے کے باعث آپ نہیں نکال سکے لہٰذا آپ نے اندر ہی سے نکال لیا۔ دنیا کے ہر معاملے میں بھی نبی کی عقل اسی طرح سے تیز ہوتی ہے جس طرح سے دینی معاملات میں تیز ہوتی ہے۔

وَمَسَحَ بِرَاسِهِ: آپ نے اپنے سر کا مسح کیا۔ اس سے مالکیہ کے مسلک کی تائید ہوتی ہے مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اس وقت آپ کے سر پر عمامہ نہ ہو۔

وَقَدْ صَلّٰى بِهِمْ رَكْعَةً: معلوم ہوتا ہے فجر کی نماز تھی اور آنحضرت ﷺ کو کچھ دیر ہوئی تو لوگوں نے نماز شروع کر دی کہ وقت تنگ تھا۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے ایک رکعت پڑھا دی، تب حضور پہنچے۔

دیکھیے پیغمبر موجود ہیں لیکن اس کے باوجود لوگوں نے نماز وقت پر ادا کرنا شروع کر دی۔ یہ حضور کی تعلیم کا نتیجہ تھا۔ آپؐ نے ایک رکعت امام کے پیچھے پڑھی اور ایک رکعت خود پڑھی۔

قَالَ اَحْسَنْتُمْ: یعنی تم لوگوں نے ٹھیک کیا۔ جب نماز کا وقت ہو گیا تو میرا انتظار نہیں کیا اور نماز پڑھ لی۔ یہ امت کے لیے ایک عام تعلیم ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی آخری بیماری میں جب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ امامت کرا رہے تھے تو حضور کے آنے پر ابوبکرؓ پیچھے ہٹ گئے۔ حضورؐ نے ان کو اشارہ سے روکا مگر انہوں نے حضور کے لیے جگہ چھوڑ دی۔ نماز ختم ہونے پر آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ جب میں نے تمہیں روکا تھا تو تم پیچھے کیوں ہٹ گئے۔ ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ میں نے یہ نہیں مناسب سمجھا کہ ابن ابی قحافہ پیغمبر کی امامت کرے۔

امت کو تعلیم دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ بہترین موقع پیدا فرمایا کہ نبی ﷺ کچھ دیر میں آئے تو لوگوں نے وقت پر نماز پڑھ لی اور لوگوں کو جو کچھ گھبراہٹ ہوئی تو آپ نے اس گھبراہٹ کو دور کر دیا کہ کوئی بات نہیں۔ بہت اچھا ہو گیا۔ تم لوگوں نے ٹھیک کیا کہ وقت پر نماز پڑھ لی۔

وَمَسَحَ عَلَى الْخُفَّيْنِ: اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے خفین (موزوں) پر بھی مسح کیا۔ اب ظاہر ہے کہ جب تک "خف" کی نوعیت نہ معین ہو کہ وہ کیا چیز تھی، اس کی شکل کیا تھی، اس کے حدود و قیود کیا تھے، اس وقت تک اس سے مسائل مستنبط نہیں ہو سکتے اور ہمارے موزوں کا مسئلہ بھی مشکل ہی رہے گا کہ ہم ان پر مسح کر سکتے ہیں یا نہیں؟

خف چمڑے کا موزہ ہوتا تھا جس کے ساتھ کچھ نمدا بھی چڑھایا جاتا تھا۔ عرب جب اسے پہن لیتے تو وہ ان کو سردی سے بھی بچاتا اور جوتے سے بھی مستغنی کر دیتا۔ وہ ان کو کنکر پتھر والی زمین پر چلنے میں آرام پہنچاتا۔ اس زمانے میں مسجد نبوی میں فرش پر کنکر ڈالے گئے تھے اس لیے لوگ بے تکلفی سے خف پہنے مسجد میں آ سکتے تھے۔ سفر تبوک میں نبی ﷺ نے بھی خف پہنے ہوئے تھے تو آپ نے ان پر مسح کیا۔

اب فقہا جب مسح کی علت پر غور کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ موزہ اگر خف کی شکل کا ہو، اس میں پانی نفوذ نہ کرے اور وہ میلوں چلنے پر بھی نہ پھٹے تب اس پر مسح کیا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی کسی دوسری قسم کے موزے پر مسح کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

جب ہم اپنے موزوں اور جرابوں پر غور کرتے ہیں تو ان کی شکل ضرور خف سے مختلف ہے لیکن ہم ان کو پہن کر ہاکی، فٹ بال وغیرہ کھیل سکتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم جوتوں کے بغیر موزوں کی یہ بے قدری نہیں کرتے۔ جہاں تک پانی کے نفوذ کا تعلق ہے تو اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ پانی کے حوض میں اتر جائیں جب بھی پانی نفوذ نہ کرے تو یہ شرط خف بھی پوری نہیں کرتے۔ لیکن اگر مطلب یہ ہے کہ بھیگا ہوا ہاتھ پھیرنے سے پانی نفوذ نہ کرے تو جراب، اور خاص کر گرم جراب، اس شرط کو پورا کرتی ہے۔

لیکن فقہاء کی قائم کردہ یہ تینوں شرطیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ خف ہی کی شکل پر اصرار کی کیا بنیاد ہے؟ پانی اگر نفوذ کر بھی جائے تو اس سے کون سا طوفان آ جائے گا جس سے بات بگڑ جائے گی۔ ان چیزوں کو عقل و نقل سے کوئی تعلق نہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ جب مسئلہ مسح کا ہے تو پانی کی کوئی کارکردگی ایسی نہیں جو زیر بحث آتی ہو۔

میرے نزدیک استنباط اس بنیاد پر ہو گا کہ دونوں صورتوں میں علت مشترک کیا ہے۔ میری رائے میں یہ علت رفع زحمت ہے۔ اوپر جو حکم عمامہ کا گزرا یہ مسح بھی اسی طرح کا ہے۔ موزے اتارنے

میں جوزان ہے اس سے بچانے کے لیے ان پر مسح کی اجازت دی گئی۔ یہ علت جس طرح خف میں پائی جاتی ہے اسی طرح جراب میں بھی پائی جاتی ہے۔ میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ آپ اگر سفر کر رہے ہیں یا شکار کے لیے نکلے ہوئے ہیں یا کسی فوجی مہم میں ہیں، اور آپ موزے اور جوتے دونوں پہنے ہوئے ہیں تو آپ جوتے پر مسح کر کے بھی نماز پڑھ سکتے ہیں۔ آپ کو صرف یہ احتیاط کرنی ہوگی کہ جوتے میں کوئی نجاست نہ لگی ہو۔ ہمارے ہاں احناف ایک دینار کے بقدر نجاست لگی ہونے پر بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔

اب رہ گیا یہ سوال کہ توقیت اس میں کیا ہو؟ یعنی کتنی دیر تک مسح کیا جا سکتا ہے، تو فقہاء عام طریقے پر ایک دن مقیم کے لیے اور تین شبانہ روز مسافر کے لیے حد مقرر کرتے ہیں۔ مالکیہ کے نزدیک آدمی اس وقت تک مسح کر سکتا ہے جب تک اس کو غسل کی ضرورت نہ پیش آئے۔ تو گویا مالکیہ توقیت کے سرے سے قائل ہی نہیں ہیں۔ فوج کے لیے مالکیہ کا مذہب بہت آسان ہے اس لیے کہ توقیت تو ان کے ہاں ہے ہی نہیں۔ تین شبانہ روز کی حد بندی کی کوئی منطقی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ تین شبانہ روز کیوں؟ یہ محض عقلیت کا اعمال ہے، یہ محض ذوقی بات ہے، جس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

میں اپنے ذوق سے یہ بات کہتا ہوں کہ ہمارے مروجہ موزوں پر لمبی توقیت کی ضرورت نہیں ہے۔ سردیوں میں فجر کے وضو کے بعد نہایت اہتمام سے ان کو پہن لیجیے اور عشاء کی نماز پڑھ کے ان کو اتار دیجیے۔ میرا عمل یہی ہے۔ اس بات کو یاد رکھیے کہ فقیہ جب کوئی بات اپنی فقاہت سے کہتا ہے تو یہ عقلیت ہے۔ اس میں جس طرح سے دوسرے فقہا کو حق حاصل ہے کہ وہ بات کریں ہمیں بھی حق حاصل ہے کہ ہم بھی بات کریں۔ یاد رکھیے کہ معصوم صرف اللہ کے پیغمبر ہیں اور بے خطا قرآن مجید ہے۔ اگر کسی مسئلے میں کوئی حدیث یا روایت موجود ہے تب تو بہر حال اس روایت کی جرح کر کے اس کا تجزیہ کرنا پڑے گا اور رد کرنے کی صورت میں دلائل دینے ہوں گے۔ بصورت دیگر اس کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑے گا۔ میں یہ واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں سخت متقشف قسم کا آدمی ہوں۔ مجھ کو آزادی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے مگر میں مقید صرف اللہ اور رسول کا ہوں اور کسی کا نہیں۔ فقیہ میں خود بھی ہوں، جس طرح دوسرے فقہا معصوم نہیں اسی طریقے سے میں بھی معصوم نہیں!

۲۔ وَحَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ وَ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ اَنَّهُمَا اَخْبَرَاهُ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ قَدِمَ الْكُوفَةَ عَلَى سَعْدِ بْنِ اَبِي وَقَّاصٍ وَهُوَ اَمِيرُهَا فَرَآهُ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ يَمْسَحُ عَلَى الْخُفَّيْنِ. فَاَنْكَرَ ذٰلِكَ عَلَيْهِ. فَقَالَ لَهُ سَعْدٌ: سَلْ اَبَاكَ اِذَا قَدِمْتَ عَلَيْهِ. فَقَدِمَ عَبْدُاللّٰهِ فَنَسِيَ اَنْ يَسْاَلَ عُمَرَ عَنْ ذٰلِكَ حَتّٰى قَدِمَ سَعْدٌ. فَقَالَ: اَسَاَلْتَ اَبَاكَ؟ فَقَالَ: لَا. فَسَاَلَهُ

عَبْدُاللّٰهِ. فَقَالَ عُمَرُ: اِذَا اَدْخَلْتَ رِجْلَيْكَ فِي الْخُفَّيْنِ وَهُمَا طَاهِرَتَانِ فَامْسَحْ عَلَيْهِمَا. قَالَ عَبْدُاللّٰهِ: وَ اِنْ جَاءَ اَحَدُنَا مِنَ الْغَائِطِ؟ فَقَالَ عُمَرُ: نَعَمْ. وَ اِنْ جَاءَ اَحَدُكُمْ مِنَ الْغَائِطِ.

ترجمہ:۔ نافع اور عبداللہ بن دینار دونوں نے مالک کو خبر دی کہ عبداللہ بن عمرؓ سعد بن ابی وقاصؓ کے پاس کوفہ آئے۔ وہ اس زمانے میں وہاں کے گورنر ہوتے تھے۔ عبداللہ بن عمرؓ نے دیکھا کہ وہ خفین پر مسح کرتے ہیں تو یہ چیز ان کو بہت عجیب سی معلوم ہوئی۔ سعدؓ نے ان سے کہا کہ اپنے والد بزرگوار سے پوچھ لیجیے جب ان کے پاس جائیے گا۔ عبداللہ بن عمرؓ مدینہ آئے مگر حضرت عمرؓ سے اس کے متعلق پوچھنا بھول گئے یہاں تک کہ سعدؓ بھی آ گئے۔ انہوں نے عبداللہ بن عمرؓ سے پوچھا کہ آپ نے کیا اپنے ابا جان سے پوچھ لیا تھا۔ انہوں نے کہا نہیں۔ پھر عبداللہؓ نے ان سے پوچھا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر تم نے اپنے پاؤں خفین کے اندر اس حالت میں داخل کیے ہوں کہ تمہارے دونوں پاؤں پاک ہوں تو ان کے اوپر مسح کرلو۔ حضرت عبداللہؓ نے کہا کہ اگر کوئی شخص قضائے حاجت کر کے آیا ہو تو؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جی ہاں اگر چہ وہ قضائے حاجت کر کے آیا ہو جب بھی۔

وضاحت:۔ فَاَنْكَرَ ذٰلِكَ عَلَيْهِ: یعنی موزوں پر مسح کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کچھ اجنبی سی چیز محسوس کیا اور اس کا حضرت سعد بن ابی وقاصؓ پر برملا اظہار بھی فرمایا۔

موزوں پر مسح کے ذیل میں یہ ایک جامع روایت ہے جن میں تین جلیل القدر صحابہ کی رائے سامنے آتی ہے۔

۳۔ وَحَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عُمَرَ بَالَ فِي السُّوقِ. ثُمَّ تَوَضَّاَ فَغَسَلَ وَجْهَهُ وَيَدَيْهِ وَ مَسَحَ رَاْسَهُ. ثُمَّ دُعِيَ لِجَنَازَةٍ لِيُصَلِّيَ عَلَيْهَا حِيْنَ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَمَسَحَ عَلَى خُفَّيْهِ ثُمَّ صَلَّى عَلَيْهَا.

ترجمہ:۔ نافعؒ سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ (کو ضرورت پیش آئی تو انہوں) نے بازار میں کسی جگہ پیشاب کیا۔ پھر وضو کیا، پھر اپنا منہ دھویا اور ہاتھ دھوئے اور اپنے سر کا مسح کیا۔ پھر جب وہ مسجد میں داخل ہوئے تو ایک جنازے کے لیے ان سے کہا گیا کہ اس کی امامت کرا دیں تو انہوں نے خفین پر مسح کیا، پھر نماز جنازہ پڑھائی۔

وضاحت:۔ اگر نماز جنازہ نماز ہے تب تو اس کے لیے نماز کی شرائط ہوں گی لیکن اگر نماز جنازہ، جیسا کہ بعض لوگوں کی رائے ہے صرف دعا ہے، تو اس کے لیے تمام شرطیں ضروری نہیں ہیں۔ حضرت عبداللہ بن

عمرؓ کے عمل میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ انہوں نے موزوں پر مسح ضرورت کے تحت کیا ہے۔ پہلے نماز کا اہتمام تو رہا نہیں تھا، وضو سر کے مسح تک کیا۔ جب معلوم ہوا کہ نماز کی بھی ضرورت ہے تو اسے مکمل کر لیا۔

البتہ اس سے یہ مسئلہ واضح ہوتا ہے کہ اگر وضو خشک ہو گیا ہو تو کچھ وقفے کے بعد بھی موزوں پر مسح ہو سکتا ہے۔ وضو کا تازہ رہنا چنداں ضروری نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ کا اسی پر عمل ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وضو میں یہ بات ہے کہ اگر آپ ترتیب تک میں بھی کوئی چیز بھول گئے ہیں تو اعادہ کرنا پڑے گا لیکن اگر آپ نے وضو کیا اور خفین کا مسح رہ گیا ہے اور وضو خشک ہو گیا تو پھر بعد میں صرف مسح کر لیں گے۔ اتنا کافی ہے پورے وضو کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے۔

۴۔ وَحَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ رُقَيْشٍ أَنَّهُ قَالَ رَأَيْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ أَتَى قُبَا فَبَالَ. ثُمَّ أُتِيَ بِوَضُوءٍ فَتَوَضَّأَ فَغَسَلَ وَجْهَهُ وَيَدَيْهِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ. وَمَسَحَ بِرَأْسِهِ وَمَسَحَ عَلَى الْخُفَّيْنِ. ثُمَّ جَاءَ الْمَسْجِدَ فَصَلَّى.

ترجمہ:۔ سعید بن عبدالرحمٰن بن رقیش کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالکؓ کو دیکھا وہ قبا آئے اور پیشاب کیا۔ پھر وضو کا پانی لایا گیا تو انہوں نے وضو کیا۔ انہوں نے اپنا منہ اور دونوں ہاتھ کہنیوں تک دھوئے، اپنے سر کا مسح کیا اور خفین پر مسح کیا۔ پھر مسجد میں آ کر نماز پڑھی۔

وضاحت:۔ اس روایت سے بھی موزوں پر مسح کی تصریح ملتی ہے۔

امام مالک کے فتوے:

۔ یحییٰ کہتے ہیں کہ ایک ایسے شخص کے بارے میں فتویٰ پوچھا گیا جس نے نماز کا وضو کیا پھر اس نے اپنے موزے پہن لیے۔ (پھر اس کو پیشاب کرنے کی ضرورت پیش آئی) تو اس نے پیشاب کیا۔ اس نے اپنے موزے اتار کر پھر پہن لیے تو کیا وہ وضو از سر نو کرے گا۔ امام مالک نے کہا کہ وہ اپنے موزے اتارے اور اپنے پاؤں دھوئے۔ خفین پر مسح وہی کرے گا جس نے اپنے پاؤں خفین میں اس حالت میں داخل کیے ہوں کہ وہ وضو کی پاکی رکھتے ہوں۔

رہا وہ جس نے اپنے پاؤں خفین میں داخل کیے ہوں جبکہ وہ وضو کی پاکی نہ رکھتے ہوں تو وہ خفین پر مسح کا حق دار نہیں ہے۔

۔ یحییٰ کہتے ہیں کہ امام مالک سے ایک ایسے شخص کے بارے میں فتویٰ پوچھا گیا کہ جس نے وضو

کیا اور وہ اپنے موزے پہنے ہوئے تھا۔ لیکن وہ موزوں پر مسح کرنا بھول گیا۔ یہاں تک کہ اس کا وضو خشک ہو گیا اور اس نے نماز پڑھ لی۔ تو انہوں نے فتویٰ دیا کہ ایسے شخص کو چاہیے کہ اپنے موزوں پر مسح کرے اور نماز کا اعادہ کرے البتہ وضو نہیں دہرائے گا۔

۔ اور امام مالک سے ایک شخص کے بارے میں فتویٰ پوچھا گیا جس نے اپنے پاؤں دھوئے پھر موزے پہن لیے۔ پھر اس نے وضو شروع کیا۔ تو انہوں نے فتویٰ دیا کہ نہیں! وہ اپنے موزے اتارے اور وضو کرے اور اپنے پاؤں دھوئے۔

یہاں یہ امر یاد رکھیے کہ ہماری رائے میں موزے اور جوتا ایک ہی یونٹ ہے۔ آپ مسح جوتے پر بھی کر سکتے ہیں اور موزوں پر بھی۔

(۹) بَابُ الْعَمَلِ فِي الْمَسْحِ عَلَى الْخُفَّيْنِ

باب: موزوں پر مسح کے طریق کار کا بیان

۱۔ وَحَدَّثَنِي يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ أَنَّهُ رَأَى أَبَاهُ يَمْسَحُ عَلَى الْخُفَّيْنِ. قَالَ وَكَانَ لَا يَزِيدُ إِذَا مَسَحَ عَلَى الْخُفَّيْنِ عَلَى أَنْ يَمْسَحَ ظُهُورَهُمَا وَلَا يَمْسَحُ بُطُونَهُمَا.

ترجمہ:۔ ہشام بن عروہؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے والد کو موزوں پر مسح کرتے دیکھا۔ بتاتے ہیں کہ وہ جب مسح کرتے تو موزوں کے اوپر کے حصے ہی پر کرتے اور ان کے نچلے حصے پر مسح نہیں کرتے تھے۔

وضاحت:۔ اس روایت سے اس بات کی وضاحت ہو گئی کہ مسح موزوں کی اوپر والی ہی سطح پر کرنا عقلی اور نقلی ہے۔ اس پر زیادتی، زیادتی کے ذیل میں آتی ہے جو دین میں نہ تو مطلوب ہے اور نہ ہی پسندیدہ۔

امام مالک کے فتوے:

۔ امام مالک سے بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے ابن شہاب سے موزوں پر مسح کے بارے میں پوچھا کہ اس کی شکل کیا ہو؟ تو ابن شہاب نے اپنا ہاتھ موزے کے نیچے داخل کیا اور دوسرا اس کے اوپر۔ پھر دونوں کو گزارا۔

یحییٰ کہتے ہیں کہ امام مالکؒ نے کہا کہ اس باب میں ابن شہاب کا قول بڑا پسندیدہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام مالک کا مذہب بھی یہی ہے۔ یاد رکھیے کہ جب امام صاحب کہتے ہیں کہ اس بارے میں میرا پسندیدہ قول یہ ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ اس کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس میں وجوب وغیرہ کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اس سے زیادہ کا تقاضا بھی نہیں ہے۔

اس مسئلے میں مذکورہ بالا مباحث سے مالکیہ کا رجحان معلوم ہو گیا کہ ان کا عمل ابن شہاب کے فتووں پر ہے۔ یعنی موزوں پر مسح اوپر نیچے دونوں طرف سے کیا جائے گا۔ شوافع کے نزدیک اوپر کا فرض ہے اور نیچے کا مسح کرنا سنت ہے۔ گویا نچلے حصہ کو اصلاً اہمیت حاصل نہیں ہے۔ جہاں تک احناف کا تعلق ہے تو ان کے نزدیک مسح صرف اوپر ہی کا ہو سکتا ہے، وہ نیچے کا سنت کے درجے میں بھی نہیں مانتے ہیں اور یہی ہمارا بھی قول ہے۔ اس مسئلے میں کسی کو نص کی حیثیت تو حاصل ہے نہیں۔ محض ذوقی فتوی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ جہاں بات سرے سے عقلی ہوتی ہے وہاں حنفیہ کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ان کے ہاں یہ بات بہت واضح ہے کہ عقل کی بات کرتے ہیں۔

دین کی بنیاد بہر حال عقل و فطرت پر استوار کی گئی ہے۔ مسح یا تیمم ہی کو لیجیے۔ ان سے مقصود طہارت تو ہو نہیں سکتی۔ ان سے مقصود اصل کی یاد ہے۔ یعنی جب اصل چیز کے کرنے کا امکان نہیں ہے یا اس کا موقع نہیں ہے تو اس خیال سے کہ اصل چیز ذہنوں سے نکل نہ جائے اس کی یادداشت کو قائم رکھنے کے لیے ایک شکل دین میں رکھی گئی ہے۔ مثلاً نماز میں آپ اگر باقاعدہ سجدہ نہیں کر سکتے تو جھک کر کر لیجیے، صرف اتنا ہی کافی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ محض جھکنے سے سجدے کے تقاضے اور آداب تو پورے نہیں ہو جائیں گے البتہ اس سے سجدے کی یاد باقی رہتی ہے۔ تو میرے نزدیک اس نوعیت کی تمام رخصتوں کی نوعیت اصل کی یادگار کی ہے۔ یادداشت کے طور پر اصل کی یادگار بھی پسندیدہ اور کافی ہے۔ اب مسح کے مسئلے میں عقلاً اوپر کا ہاتھ پھیر دینا کافی ہے، نیچے کا ہاتھ پھیرنے کے لیے عقل گویا مستعار لینی پڑے گی۔ اس بارے میں چونکہ کوئی حدیث نہیں ہے، محض عقل سے رہنمائی لینی پڑے گی، تو میرے نزدیک اس معاملے میں حنفیہ کا مسلک قوی ہے۔

(ترتیب: ماجد خاور)

خالد مسعود

قرآن مجید کی جمع و تدوین

رسول اللہ ﷺ کے پاس اپنی امت کے لیے جو سب سے بڑی امانت تھی وہ قرآن حکیم تھا۔ یہی وہ الٰہی پیغام تھا جس کو تمام انسانوں تک پہنچانے پر آپ مامور تھے اور جس کو قیامت تک صحیح و سالم حالت میں محفوظ رکھنے کی ذمہ داری میں آپ کے بعد آپ کی امت بھی شریک ہے۔ لہٰذا قرآن حکیم کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں آپ نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔

قرآن مجید کے حوالہ سے کچھ باتیں طے اور وحی الٰہی کے ذریعے سے ثابت شدہ تھیں۔ ایک یہ کہ

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ

یعنی یہ کتاب اللہ کی جانب سے نازل ہو رہی تھی اور اس کو محفوظ رکھنے کا ذمہ بھی خود اس نے اٹھایا، اور

اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ

یعنی یہ ایک محفوظ صحیفہ تھا جس کے اندر باطل نہ سامنے سے گھس سکتا تھا نہ اس کے پیچھے سے۔

دوسری یہ کہ:

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ

یعنی قرآن ضرورت وقتی کے مطابق متفرق آیات کی صورت میں جو نازل ہو رہا تھا تو اس کو ایک نظم میں پرونا اور پھر نئی ترتیب پر حضور کو سنانا بھی اللہ تعالیٰ کے ذمہ تھا۔ اس کے بارے میں حضور کو حکم تھا کہ جب نئی ترتیب پر آپ اس کو سن لیں تو اس کے مطابق لوگوں کو سنائیں۔

ان وعدوں کے ایفا کی شکل یہ ہوئی کہ نزول قرآن کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کے سب سے طاقتور اور معتمد علیہ فرشتے کے سپرد ہوئی جس نے رسول اللہ کے قلب پر قرآن کو اتارا اور اس طرح شیاطین کی در اندازی کی راہیں بالکل مسدود کر دیں۔ پھر قرآن نے بالکل آغاز ہی میں یہ اشارہ دے دیا کہ اللہ تعالیٰ نے قلم کو تعلیم کا ذریعہ بنایا۔ فرمایا:

اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (علق: ۳-۴)

(پڑھو اور تمہارا رب بڑا فیاض ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی)

یعنی مطلوب کام یہ تھا کہ قرآن کو لکھوا کر کتابی شکل میں محفوظ کرنا ہو گا۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے مکہ ہی میں قرآن کو لکھوانے کا اہتمام کر لیا تھا جس پر قریش کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ یہ شخص خود کلام گھڑتا ہے اور اس نے

کچھ ایسے لوگ بھی فراہم کر لیے ہیں جو صبح و شام اس کو لکھواتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ زندگی بھر آپ نے جاری رکھا یہاں تک کہ کامل قرآن حتمی ترتیب پر اپنی امت کے لیے تیار کروا دیا۔'

سورہ قیامہ کی مذکورہ آیت سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ یہ وعدے حضور کی زندگی ہی میں پورے ہوں گے نہ کہ اس کے بعد، ورنہ آپ کو یہ حکم دینے کے کیا معنی کہ جب ہم قرآن کو جمع کر کے آپ کو سنا چکیں تو پھر اس ترتیب کے مطابق آپ اسے لوگوں کو سنائیں۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ قرآن جمع ہو کر اللہ تعالی کی ہدایات کے مطابق مرتب ہوتا، آپ اس ترتیب کے مطابق لوگوں کو سناتے اور اس کے مطابق لکھوا کر امت کے حوالہ کرتے۔ گویا تکمیل قرآن کے بعد بھی آپ کو اتنی مہلت ملنی ضروری تھی کہ آپ یہ کام اپنے ہاتھوں سے سرانجام دیتے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے یہ ذمہ داری کس طرح ادا کی:

تلاوت قرآن:

قرآن مجید کے حوالہ سے حضور کی پہلی ذمہ داری تلاوت آیات کی تھی۔ آپ کا معمول تھا کہ جتنا قرآن نازل ہوتا وہ آپ بار بار لوگوں کو سناتے تاکہ اسلام کی دعوت کے لیے ان کے ذہن صاف ہوں اور وہ حق کو قبول کریں۔ جو لوگ اسلام لا چکے تھے ان کے لیے یہ نئی تعلیم ایک نعمت ثابت ہوتی جس کو وہ لپک کر قبول کرتے۔ اس کی روشنی میں اپنے عقائد، اعمال کی اصلاح کرتے، اس کو اپنے سینوں میں محفوظ کرتے اور اس پر باہم مذاکرے کرتے۔ اس طرح یہ قرآن ان کی زندگیوں میں داخل ہو جاتا اور ذہنوں کی کشادگی کا باعث بنتا۔

حفظ قرآن:

حضور کی دعوت کے مکی دور ہی سے نماز باجماعت کا اہتمام ہوتا تھا۔ حضور کا طریقہ یہ تھا کہ عشا اور فجر کی نمازوں میں طویل سورتوں کی تلاوت کرتے۔ اس طرح جو قرآن بار بار پڑھا جاتا اس کا معتد بہ حصہ مقتدیوں کو بھی ازبر ہو جاتا۔ بعض صحابہ کو قرآن سے بے حد شغف تھا اور وہ ساتھ ساتھ حفظ کرتے رہتے۔ ایسے صحابہ سے حضور وقتاً فوقتاً قرآن سنانے کی فرمائش کرتے۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ سے قرآن سننے کی روایتیں کتب حدیث میں موجود ہیں۔

جن صحابہ کو قرآن زیادہ یاد ہوتا ان کو اسلام میں نئے داخل ہونے والوں کو قرآن پڑھانے کی ذمہ داری سونپی جاتی۔ روایات میں ہے کہ عمار بن یاسرؓ حضرت عمرؓ کی ہمشیرہ فاطمہ بنت الخطاب کو قرآن پڑھایا کرتے۔ تعلیم قرآن کی اولین درس گاہ دار ارقم تھی جہاں صحابہ کرام جمع ہو کر قرآن سیکھتے اور اس کو حفظ

کرتے۔ صحابہ کرام میں قرآن کے ساتھ شغف ہی کا نتیجہ یہ تھا کہ حبشہ جانے والے مسلمانوں کو جب نجاشی نے دربار میں طلب کیا اور ان سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ان کے موقف کی بابت سوال کیا تو جعفرؓ بن ابی طالب نے برسر موقع قرآن کی ان آیات کی تلاوت کر دی جن میں نجاشی کے سوالوں کا جواب تھا۔

تعلیم قرآن:

بیعت عقبہ میں اوس و خزرج کے وفد نے یہ درخواست کی کہ دین سکھانے کے لیے کسی آدمی کو ان کے ہمراہ بھیجا جائے۔ تو حضور نے مصعب بن عمیرؓ کو یثرب بھیجا تاکہ وہ مسلمانوں کو قرآن سکھائیں۔ ہجرت کے بعد کئی قبائل کے اندر آپ نے معلمین قرآن بھیجے۔ جب بعض معلمین کے ساتھ قبائل نے بدعہدی کی اور ان کو نقصان پہنچایا تو حضور نے مسجد نبوی کے پاس قرآن کی تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے ایک چبوترہ بنوا دیا اور قبائل کو پیغام دیا کہ وہ اپنے آدمیوں کو قرآن سیکھنے کے لیے مدینہ بھیجیں۔ قبائل سے آنے والے لوگ اسی چبوترہ پر قیام کرتے، قرآن حفظ کرتے اور رسول اللہؐ سے دین سیکھتے۔ اسلامی معاشرہ ان کی جملہ ضروریات کو پورا کرتا۔ یہ لوگ اصحاب صفہ کہلاتے۔ ابوداؤد کی روایت کے مطابق عبادہ بن الصامت تعلیم قرآن پر مقرر تھے۔ جب ایک گروپ دین کی ضروری باتیں سیکھ لیتا تو اپنے قبیلہ میں واپس چلا جاتا اور اس کی جگہ دوسرا گروپ آ جاتا۔

اسلامی معاشرہ میں ان لوگوں کو زیادہ عزت کا مستحق سمجھا جاتا جو قرآن کا زیادہ علم رکھتے تھے۔ حضور ان کو دوسروں پر فوقیت دیتے اور ان کی رایوں پر زیادہ اعتماد کرتے۔ لوگوں میں حلقے بنا کر قرآن پر غور و فکر کرنے کا رجحان پایا جاتا تھا۔ روایتوں میں آیا ہے کہ نبی ﷺ جب مسجد میں تشریف لاتے اور لوگوں میں یہ انہماک دیکھتے تو مسرت کا اظہار فرماتے اور ان حلقوں میں بیٹھ جاتے۔ متعدد مثالیں موجود ہیں کہ آپ نے قرآن فہمی میں فوقیت کی بنا پر کم سن نوجوانوں کو قبائل کی رہنمائی کا کام سونپ دیا۔ مکہ صنادید قریش کا بڑا مرکز تھا جہاں کی امارت کے لیے ایک سے ایک بڑا نام زیر غور آ سکتا تھا لیکن فتح مکہ کے بعد آپ نے شہری امارت پر ایک نوجوان عتاب بن اسیدؓ کا تقرر کیا۔ اس کی وجہ ان کا قرآن میں شغف تھا۔

کتابت قرآن:

قرآن مجید کی کتابت کا کام حضور نے مسلسل جاری رکھا۔ کم و بیش چالیس صحابہ کے نام کتابوں میں ایسے آئے ہیں جنھوں نے کتابت وحی میں حصہ لیا۔ ان میں مکی بھی ہیں اور مدنی بھی۔ جب بھی قرآن کی کچھ آیات نازل ہوتیں تو حضور کتابت جاننے والے صحابی کو طلب فرماتے اور اس کو یہ ہدایت دیتے کہ ان آیات کو فلاں سورہ میں فلاں آیت کے بعد اور فلاں آیت سے پہلے لکھ دو۔ یہ ہدایت اس لیے دی جاتی

کہ قرآن کو نزولی ترتیب پر لکھوانا مدنظر نہ تھا بلکہ قرآن اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق جمع ہو رہا تھا اور اس کو نئی ترتیب دی جا رہی تھی۔ یہ ترتیب توقیفی کہلاتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے تحت مقرر کردہ ترتیب۔ قرآن آج تک اسی ترتیب سے لکھا جاتا اور اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اس زمانہ میں دشمنوں کی یہ کوشش ہے کہ وہ اپنی من گھڑت ترتیب پر نیا قرآن مدون کریں۔ اسی لیے وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ موجودہ ترتیب صحابہ اور خصوصاً زید بن ثابتؓ کی قائم کردہ ہے اور اس کی اصلاح ضروری ہے کیونکہ اس میں ایڈیٹنگ کے نقائص ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ترتیب اللہ کے حکم سے حضور کی نگرانی میں قائم ہوئی۔ اس میں کسی انسانی کاوش کو دخل نہیں ہے۔

نبی ﷺ جو کتابت کرواتے وہ اپنے خاص مصحف میں ترتیب سے رکھواتے۔ ابتداءً یہ مصحف مسجد نبوی کے ایک ستون کے پاس ایک صندوق میں رکھا رہتا۔ اس ستون کا نام ہی 'اسطوانہ مصحف' پڑ گیا۔ صحابہ یہیں بیٹھ کر اپنی ضرورت کا قرآن لکھ لیا کرتے۔ اس طرح اصل مصحف محفوظ رہتا۔ زید بن ثابتؓ کا قول روایات میں نقل ہوا ہے کنا عند رسول اللہ نؤلف القرآن من الرقاع۔ ہم رسول اللہؐ کے پاس اوراق کی مدد سے قرآن مرتب کیا کرتے تھے۔ (اتقان) بعد میں جب منافقین و معاندین کی ریشہ دوانیاں زیادہ ہوگئیں تو رسول اللہ ﷺ نے حفاظت کے نقطہ نظر سے یہ مصحف مسجد سے اٹھوا دیا اور اس کو ام المومنین حضرت حفصہؓ کے حجرہ میں رکھوا دیا۔

جبریلؑ سے مذاکرہ:

حضور کو توقیفی ترتیب پر قرآن سنانے کا انتظام من جانب اللہ ہوا۔ حضور ہر رمضان میں مسجد میں معتکف ہوتے اور جبریل امینؑ کے ساتھ قرآن کا مذاکرہ ہوتا۔ جب قرآن کی تکمیل ہوگئی تو آخری رمضان میں حضور نے بیس دن کا اعتکاف کیا اور حتمی ترتیب پر قرآن دو مرتبہ سنایا۔ اس طرح ایک طرف جمع قرآن کا کام مکمل ہوا، وعدہ الٰہی کے مطابق آپ کو قرآن مرتب شکل میں سنا دیا گیا اور پھر آپ نے اس ترتیب پر جبریل کو قرآن سنایا اور اسی کی امت کو تعلیم دی۔

یہ بات روایات سے ثابت ہے کہ حضور کی حیات مبارکہ ہی میں لوگوں نے مصحف کی نقول اپنے استعمال کے لیے تیار کر لی تھیں۔ ایک روایت کے مطابق حضور نے مصحف میں دیکھ کر تلاوت کرنے والے کے لیے بن دیکھے تلاوت کرنے والے کی نسبت دوہرے اجر کی بشارت دی۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب حضور کی حیات مبارکہ میں مصاحف میسر آچکے ہوتے۔ ایک اور روایت کے مطابق حضور نے سفر میں مصحف کو ساتھ لے جانے کی ممانعت کی تاکہ اس کے اوراق کفار کے ہاتھ نہ لگیں اور وہ ان کو ضائع نہ کر دیں۔

روایت کے مطابق حضور اپنے زمانہ میں قرآن کو ہڈیوں، لکڑی کی تختیوں، چمڑے اور اس طرح کی متفرق چیزوں پر لکھواتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ قرآن حضورؐ کی رحلت کے وقت مرتب شکل میں نہ تھا۔ یہ بات اس صورت میں صحیح مانی جا سکتی ہے جب آنحضرت ﷺ لکھنے کے کسی دوسرے میٹریل سے آشنا نہ ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں جس طرح قلم کو ذریعہ تعلیم بنانے کا اشارہ ہے اسی طرح توریت کے 'رق منشور' میں لکھے جانے کا حوالہ بھی دیا ہے۔ رق کھال کے باریک پارچے کو کہتے ہیں۔ قدیم زمانہ سے یہ میٹریل، جو نہایت مضبوط اور پائیدار ہے، تورات کی کتابت کے کام میں لایا جا رہا ہے۔ اس کا طومار یعنی رول بنا لیا جاتا ہے۔ اس رول کو کھول کر پارچوں کو پھیلا کر تورات کی تلاوت ہوتی۔ اسی لیے قرآن نے ان کو رق منشور سے تعبیر کیا۔ آج بھی یہود کے یشوا توریت کا جلوس نکالتے ہیں تو اس طومار کو لے کر جلوس کے آگے چلتے ہیں۔ رسول اللہؐ کے جو مکاتیب زمانہ کی دست برد سے محفوظ رہ گئے ہیں اور مختلف عجائب گھروں میں ملتے ہیں وہ اسی رق پر لکھے گئے تھے۔ جب حضور اپنے زمانہ کے اس اعلیٰ میٹریل سے واقف تھے اور خطوط کے لیے اس کو استعمال فرماتے تھے تو قرآن کے معاملہ میں کیوں اس کو کام نہ لاتے جب کہ قرآن میں اس کا اشارہ بھی موجود تھا۔ لہٰذا ہمارے نزدیک حضور نے جو نسخہ مرتب کروایا اور ام المومنین حفصہؓ کے حجرہ میں رکھوایا وہ رق پر لکھا گیا ہوگا۔ ہڈیوں اور تختیوں پر اسکو لکھوانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر ہڈیاں اور تختیاں یا چھال اگر استعمال میں لائی گئی ہوں گی تو سفر وغیرہ میں یا عارضی طور پر جب رق کا انتظام نہ رہا ہوگا۔

پس ہمارے نزدیک رسول اللہ ﷺ نے قرآن کی امانت کا حق اپنی وفات سے پہلے ادا کر دیا۔ یہ امانت ہزاروں سینوں میں بھی محفوظ ہوگئی اور اس کا ایک معیاری نسخہ بھی کتابت شدہ حالت میں محفوظ کر دیا گیا۔ اس کے بعد یہ امت مسلمہ کی ذمہ داری تھی کہ وہ اسی اصلی حالت میں قرآن کی اشاعت کرتی اور حفظ کے ذریعے بھی کتاب اللہ کو محفوظ کرتی۔ الحمد للہ کہ امت نے یہ دونوں کام کیے ہیں۔

خلافت ابی بکرؓ میں جمع قرآن کی روایت:

ہمارے نزدیک صحیح صورت حال وہی ہے جو بیان ہوئی لیکن روایات میں خلفائے راشدین کے دور میں ترتیب و تدوین قرآن کا تصور دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ حیات رسول اللہ کے بعد کا ایک تذکرہ ہے اس لیے ہمارے موضوع سے متعلق نہیں لیکن چونکہ اس کا اثر رسول اللہ کی اعلیٰ کارکردگی پر نہایت منفی پڑتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ ان روایات کا مجمل جائزہ لیا جائے۔ پہلی روایت، جسے امام بخاری نے اپنی صحیح میں جگہ دے کر اس کو قبول عام دلوا دیا ہے، یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں جنگ یمامہ میں بہت بڑی تعداد میں حفاظ قرآن شہید ہوگئے۔ حضرت عمرؓ کو خیال ہوا کہ اگر آئندہ جنگوں میں بھی یہی

ورت حال رہی تو اس بات کا خطرہ ہے کہ قرآن کا کوئی حصہ ضائع ہو جائے اور اس کا جاننے والا کوئی نہ ہے۔ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کو قائل کیا کہ رسول اللہ کے لکھوائے ہوئے قرآن کو باقاعدہ مصحف کی ل میں مرتب کروا دیں۔ چنانچہ انہوں نے یہ فریضہ زید بن ثابت کو سونپا۔ بڑی مشکلوں اور تگ و دو کے رنہ معلوم کہاں کہاں سے آیات اکٹھی کی گئیں اور ان کو لکھوایا گیا۔ بعض آیات کی صحیح پوزیشن معلوم نہ تھی ذا ان کو محض قیاس پر سورتوں میں ٹانک دیا گیا۔

یہ روایت اگر درست مان لی جائے تو کئی حقائق سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ سب سے پہلے تو لہ تعالیٰ کا وعدہ جمع قرآن معاذ اللہ غیر ایفا شدہ ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر قرآن جمع ہو چکا تھا تو پھر زید ن ثابتؓ کو کون سی مشکل درپیش تھی کہ انہوں نے اس مجموعہ قرآن کو نقل نہیں کیا بلکہ آیتوں کی تلاش میں ل کھڑے ہوئے۔ ثانیاً یہ ماننا پڑے گا کہ مہاجرین و انصار اتنا عرصہ رسول اللہ کے ساتھ وابستہ رہے لیکن مل قرآن حفظ کرنے کی سعادت حاصل نہ کر سکے۔ چنانچہ جب آیات کی تلاش ہوئی تو کوئی حافظ قرآن امنے نہ آیا جو کہہ سکتا کہ میں نے حضور سے سن کر یوں حفظ کیا۔ جب قدیم صحابہ میں کوئی حافظ قرآن نہیں تو جنگ یمامہ میں شہید ہونے والے حفاظ کہاں سے آ گئے تھے؟ ثالثاً، روایت کے الفاظ سے یہ بھی متبادر ہوتا ہے کہ کامل قرآن یمامہ کے شہدا کے پاس بھی نہیں تھا بلکہ دوسرے لوگ بھی کچھ حصے ہی یاد کرتے تھے، ای لیے تو حضرت عمرؓ کو قرآن کے بعض حصوں کے ضائع ہونے کا خطرہ محسوس ہوا۔ اگر صدر اول کے سلمان مکمل قرآن حفظ کرتے تھے تو پھر حضرت عمرؓ کی بات کا کیا مطلب ہے؟ رابعاً، اس روایت کو تسلیم رکے آدمی اس نتیجہ کو ماننے سے بچ نہیں سکتا کہ رسول اللہؐ کے حوالے جو امانت کی گئی اور جسے سارے عالم یں پھیلانے کی ذمہ داری آپ پر ڈالی گئی، معاذ اللہ آپ اس کا حق ادا نہ کر سکے۔ نہ قرآن کو اس کی اصل رتیب پر جمع کیا اور نہ لوگوں کو اس ترتیب پر حفظ کرایا۔ خامساً، یہ نتیجہ بھی سامنے آتا ہے اور یہی درحقیقت دشمنان دین اس روایت سے منوانا چاہتے ہیں کہ موجودہ قرآن کی حیثیت مشکوک ہے۔ معلوم نہیں یہ اصل کے مطابق ہے بھی ہے یا نہیں؟ کیا معلوم اس میں بعض آیات شامل نہ ہو سکی ہوں جو بعض لوگوں کے پاس رہ گئیں اور وقت پر دستیاب نہ ہو سکیں؟ پھر اس کا الزام بآسانی خلفائے راشدین کو دیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ایک ناتمام نسخہ مرتب کروا کر امت میں رائج کر دیا۔

حدیث کی حیثیت سے اس روایت کی سند پر غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کے اولین واحد راوی زید بن ثابتؓ ہیں، جو اس کی خبر ایک ہی شخص عبید بن السباق کو دیتے ہیں، جو آگے ایک ہی شخص ابن شہاب زہری کے علم میں یہ بات لاتے ہیں۔ زہری اس کو اپنے سینکڑوں شاگردوں میں سے صرف چار اشخاص یونس، شعیب، ابراہیم اور عبدالرحمٰن بن خالد کو یہ روایت سناتے ہیں۔ اتفاق سے یہ

چاروں ثقہ شیعہ راوی ہیں۔ امام بخاری کی اپنی تحقیق کے مطابق عبید بن السباق کا انتقال ۱۱۸ھ میں ۶۸ برس کی عمر میں ہوا۔ گویا ان کا سال پیدائش ۵۱ھ ہونا چاہیے۔ زید بن ثابتؓ کے سال وفات کے بارے میں کئی قول ہیں۔ مثلاً ۴۵ھ، ۴۸ھ، ۵۴ھ۔ پہلے دو سالوں میں تو عبید ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اور آخری قول کے مطابق زید کے انتقال کے وقت ان کی عمر دو یا تین سال رہی ہوگی۔ یعنی زید سے روایت حدیث کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس طرح یہ روایت پہلی صدی ہجری میں خبر واحد عن واحد عن واحد رہی اور اس کا دوسرا کوئی شاہد موجود نہیں رہا۔ حالانکہ اگر ایسا واقعہ حقیقت میں پیش آیا ہوتا تو وہ اتنا مہتم بالشان تھا کہ اس کے بیسیوں راوی صحابہ کرام میں سے ہوتے اور وہ فخر سے بیان کرتے کہ وہ بھی اس عظیم کام میں شریک رہے۔ پس ہمارے نزدیک یہ روایت شیعہ کی خود ساختہ ہے۔ عملاً ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

خلافت عثمان میں جمع قرآن کی روایت:

دوسری روایت حضرت عثمان غنیؓ کے دور خلافت کی ہے۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ قرآن کی قرأت میں ایسا اختلاف سامنے آیا کہ مختلف لوگ اپنی اپنی قرأت کو درست اور دوسروں کی قرأت کو غلط قرار دیتے جس کے نتیجہ میں باہم ہاتھا پائی کی نوبت آ جاتی۔ جب یہ صورت حال خلیفہ سوم کے نوٹس میں لائی گئی اور اس کی وجہ یہ سامنے آئی کہ لوگ قرآن کو اس کی اصل زبان پر نہیں پڑھتے بلکہ علاقائی تلفظ اختیار کرتے ہیں تو انہوں نے تین قرشی زبان آوروں پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی اور ان کو حکم دیا کہ قرآن چونکہ قریش کی زبان پر نازل ہوا ہے لہٰذا اسی زبان پر زید بن ثابتؓ سے لکھوایا جائے۔ زید نے کتابت کی اور مصحف کی کچھ نقول اہم مرکزی شہروں میں سرکاری اہتمام سے بھجوا دی گئیں۔ لوگوں کو حکم دیا گیا کہ وہ صرف انہی نقول سے اپنے استعمال کے لیے مصحف تیار کریں اور قرآن کو صرف قریش کی زبان میں پڑھیں۔ چنانچہ اس خدمت پر حضرت عثمانؓ کو جامع القرآن کا لقب دیا جاتا ہے۔

یہ روایت بھی لاکھوں صحابہ میں سے صرف حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں اور ان سے واحد شخص ابن شہاب زہری اسے قبول کر کے آگے پھیلاتے ہیں۔ کوئی دوسرا صحابی یا تابعی اس عظیم الشان کارروائی کو بیان نہیں کرتا۔ اگر یہ روایت صحیح تسلیم کی جائے تو ماننا پڑے گا کہ حضرت عثمان کے دور خلافت سے پہلے کسی کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ ایک آیت انما یسرناہ بلسانک (ہم نے اس قرآن کو تمہاری زبان پر نازل کر کے نہایت موزوں بنا دیا ہے) بھی نازل ہو چکی ہے جس کے مطابق قریش کی زبان ہی قرآن کے معاملہ میں واحد قابل قبول زبان ہے۔ پھر حضرت عثمانؓ کے جامع القرآن ہونے کی صورت میں آیت ان علینا جمعہ (بلاشبہ اسکو جمع کرنے کی ذمہ داری ہم پر ہے) کے وعدہ کی کیا حیثیت رہی! ہو سکتا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ نے بطور امیر المومنین قرآن مجید کی نقول تیار کروا کے مختلف شہروں میں

ارسال کیں تو اس واقعہ کو ابن شہاب زہری نے ایک افسانہ کا رنگ دے دیا تاکہ حضرت ابوبکرؓ کے جمع قرآن کے موہوم واقعہ کو تقویت پہنچائی جائے اور اس طرح قرآن مجید کی محفوظیت کو مشکوک قرار دیا جائے۔

قرآن کی قرأت:

جہاں تک قرآن مجید کی مختلف قراءتوں کا تعلق ہے وہ سب بعد کے دور کی چیز ہیں۔ تمام معروف قراء کا تعلق تیسری صدی ہجری سے ہے جبکہ قرآن ایک ہی قرأت پر رسول اللہؐ کے زمانہ سے پڑھا جا رہا تھا۔ عملاً ان قراءتوں کو امت نے عام نہیں ہونے دیا اور یہ کتابوں کے اندر بند ہو کر رہ گئیں یا کبھی کبھار کسی قاری نے اپنی دھاک بٹھانے کے لیے ان کو کسی مجلس میں پڑھ دیا اور لوگوں سے داد وصول کر لی۔ امت کا اتفاق اور اجماع ایک ہی قرأت پر رہا جو عامۃ الناس کی قرأت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید ہمیشہ اسی قرأت پر لکھا گیا۔ قرآن کے قدیم ترین نسخ جو عجائب گھروں کی زینت ہیں اسی عام قرأت پر لکھے گئے ہیں۔ تیرہ سو برسوں تک کسی نے کسی دوسری قرأت پر قرآن شائع کرنے کی جسارت نہیں کی۔ مسلمانوں کے دور انحطاط میں پہلی مرتبہ ۱۹۳۰ء میں مصر میں ورش عن نافع کی قرأت پر قرآن شائع کیا گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی سوڈان میں ۱۹۷۸ء میں الدوری عن ابی عمرو اور ۱۹۸۱ء میں تیونس میں قالون عن نافع کی قراءات پر قرآن شائع ہوئے۔ یہ قرأتیں شمالی اور مغربی افریقہ کے بعض حصوں میں رائج ہیں۔ باقی تمام اسلامی دنیا کا قرآن وہی ہے جو ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

قراء نے دوسری قرأتوں کو مقبول بنانے کی خاطر من گھڑت باتیں مشہور کر رکھی ہیں تاکہ امت اس کڑوی گولی کو نگل لے لیکن ان کو اس میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ان قراءات کو سچ تسلیم کر لیا جائے تو آدمی قرآن میں تحریف کا مرتکب توفی الفور ہو جاتا ہے اور عملاً اللہ تعالیٰ کے وعدہ حفاظت پر سے اس کا ایمان اٹھ جاتا ہے۔ یہ بات بالکل غلط طور پر مشہور کر دی گئی ہے کہ ان قراءتوں سے کوئی معنوی فرق واقع نہیں ہوتا۔ ان پر خالی الذہن ہو کر غور کیجئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں نے قرآن کے متن میں اضافے کر دیے ہیں۔ بعض نے حرکتوں کو تبدیل کر کے معانی تبدیل کر دیے ہیں۔ چونکہ آغاز میں متن پر نقطے اور حرکات نہیں تھیں تو بعض لوگوں نے 'معلوم ہوتا ہے' کہ الفاظ پر طبع آزمائی کر کے تمام ممکنہ شکلیں وضع کر دیں اور ان کو قراءات کا نام دے دیا۔

قراءات کی تعداد لامحدود ہے۔ لوگوں نے بڑی کوششوں سے تعداد کو چودہ، دس یا سات تک محدود کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ان کو اگر دین کا حصہ مان لیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ حفاظت قرآن دھرا کا دھرا رہ گیا اور یار لوگوں نے قرآن میں تحریف کر ڈالی۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی قرأت ایک ہی ہے جس کو امت مسلمہ کے عظیم حصہ نے قبول کیا ہوا ہے۔

مراسلہ و مذاکرہ

امین احسن اصلاحی

خواتین کی اصلاح کا طریقہ

سوال: ہمارے معاشرے میں خواتین کی اصلاح کی کیا صورت ہے؟ مساجد اور دینی مدارس میں تو وہ نہیں جاتیں، اس کے برعکس ہر طرح کی سرگرمیوں میں حصہ لیتی ہیں۔ بازاروں میں یا شادیوں کے ہنگاموں میں، سینما گھروں میں اور دیگر سیر سپاٹوں میں وہ مردوں کے ساتھ ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں آج کل کے ماحول کو سدھارنے کے لیے آپ کیا تجویز فرمائیں گے؟

جواب: میرا کام تو تجویز ہی فرمانا ہے۔ میرا مستقل خیال یہ ہے کہ صحیح علم اور دین کا صحیح شعور ہر معاملہ میں ضروری ہے۔ اس زمانے میں دین کے شعور کی حالت یہ ہے کہ معاشرے کے اندر عورت اور مرد کے فرائض اور ذمہ داریوں کے بارے میں ایک گروہ، جو بہت تعلیم یافتہ ہے، اس کا حلقہ بھی بہت وسیع ہے، اس کے پاس ذرائع اور وسائل بھی بہت ہیں، پریس اس کے ساتھ ہے، تعلیم کا نظام اس کا معاون ہے، ریڈیو اس کا امام ہے، ٹی وی گویا اس کا ہادی و رہبر ہے، کا تصور یہ ہے کہ مغربی تہذیب نے جو نعمتیں دنیا کو دی ہیں ان میں سب سے بڑی نعمت عورت کی آزادی ہے۔ اس پر وہ پورا یقین رکھتا ہے۔

ہمارے ہاں اس طبقہ میں سے وہ لوگ جو دین کا بھی کچھ تصور رکھتے ہیں ان سے کسی خیر کی کوئی امید نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا دین بالکل رسمی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ دین کے کچھ رسوم ادا کر کے منافقوں کی طرح مسلمانوں کے اوپر مسلط رہنا چاہتے ہیں باقی ان کو دین کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ تہذیب معاشرت وغیرہ کے معاملات میں یہ بھی آزادی پسند ہیں۔

رہ گیا مذہبی گروہ جو مذہب کا مدعی اور اس کا علم بردار ہے تو واقعہ یہ ہے کہ ان کو بھی دین کا صحیح شعور نہیں ہے۔ اس کی واضح مثال ان کا بنایا ہوا شریعت بل تھا۔ جو بالکل طفلان مکتب کا بنایا ہوا تھا۔ اس میں اتنی غلطیاں اور مہملات تھیں کہ کوئی بھی اس کو چلا نہیں سکتا تھا اور وہ دین کے مطابق بھی نہیں تھا۔ یہ حضرات جب اٹھے تو ہر ایرے غیرے کی عدالتوں کو اجتہاد مطلق کا اختیار دے دیا۔ میں نے شروع میں ہی کہہ دیا تھا کہ آج کی عدالتیں معاذ بن جبل اور قاضی شریح کی عدالتیں نہیں ہیں۔ ان بے چاری عدالتوں کو صرف یہ تربیت دی جاتی ہے کہ کہ ایک بنا بنایا قانون ہو تو وہ اس میں بتا سکتے ہیں کہ اس کا اطلاق فلاں مجرم پر ہوتا ہے یا نہیں۔ آپ ان کو اجتہاد کا اختیار دے دیں تو وہ دستوری اعتبار سے، عقلی اعتبار سے شرعی

اعتبار سے کسی پہلو سے صحیح نہیں ہے۔

میری رائے میں ماحول کو سدھارنے کی ایک ہی شکل ہے وہ یہ کہ ہم مسلمان بنیں اور مسلمانوں کے طریقہ سے زندگی بسر کریں اور اپنی عورتوں کو بھی مسلمانوں کی زندگی بسر کرنے کا عادی بنائیں۔ اگر ہماری کوششوں سے ایک جتھا پیدا ہو گیا۔ جتھا کا لفظ بڑا ہے مگر میں استعمال کر رہا ہوں عورتوں اور مردوں کے مجموعہ پر۔ تو وہ اپنے ماحول کے اندر یہ بات پیدا کر سکتا ہے کہ سب صحیح معنوں میں مسلمان بن جائیں۔ اگر وہ جتھا اتنا قوی ہو گیا کہ ملک کے نظام اور معاشرے پر اثر ڈال سکتا ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ وہ قانون کو بدل دے۔ اگر یہ بات نہیں ہوگی تو فرض کر لیجیے کہ آپ کسی ہنگامے کے ذریعہ اقتدار میں بھی آ جائیں، چند دنوں کے لیے ہی سہی اور کوئی قانون پاس بھی کر دیں تو اس کا حشر وہی ہو گا جو سوڈان میں ہوا۔ اس کا نتیجہ کچھ نہیں ہو گا۔ دوسرا آئے گا اور سب ختم کر دے گا۔

میری رائے یہ بھی ہے کہ عورت اور مرد دونوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ دونوں اصلاح کے اس کام میں شرکت کریں تو کوئی کام نیکی کا ہو گا ورنہ اس کے بغیر اجتماعی نیکی کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً بچوں کی تربیت کا معاملہ ہے۔ اس میں سو فیصد عورت کا اختیار ہے۔ ایسی بیگمات تو کہیں کہیں ہوں گی جو دو ہی سال کے بچے کو کسی نرسری اسکول میں داخل کروا دیں اور شام کو ذرا سامنے کو پکارنے کے لیے آ جائیں۔ ایسی اولاد پلے گی تو آپ یقین کریں وہ دین ہی کی نہیں، ماں باپ سب کی دشمن ہو گی اور وہی کرے گی جو یورپ میں ہو رہا ہے۔

میں کوئی لیڈر نہیں ہوں اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ جتنی غلطی کی، جتنے دن کی، اگرچہ میں نے لیڈری تو نہیں کی تھی، لیکن اس پر بھی توبہ کرتا ہوں کہ اللہ مجھے معاف کرے۔ میں صرف دین کی بات بتانے والا طالب علم ہوں۔ میرے نزدیک جو بات حق ہے آپ کہتے رہیے۔ عورتوں کو بھی سمجھائیے اور مردوں کو بھی سمجھائیے۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے جو آپ کی بات مان لے پھر اس کی آپ خبر رکھیے، اس سے ملتے رہیے، اس کو تسلی دیتے رہیے، اس کا حوصلہ بڑھائیے تاکہ وہ آپ کے ذریعہ سے طاقت حاصل کرے اور آپ اس کے ذریعہ سے طاقت حاصل کریں۔ یہ کام آپ کے کرنے کا ہے۔ باقی اللہ کے اختیار میں ہے اور میری اور آپ سب کی رسائی سے بالاتر ہے۔

خانہ کعبہ پر ابرہہ کا حملہ:

سوال: کعبہ پر ابرہہ کی لشکرکشی کے واقعہ میں آپ نے یہ نقطہ نظر بیان کیا ہے کہ عربوں نے مقدور بھر

دشمن کا مقابلہ کیا اور پھر اللہ پر توکل کیا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا توکل کا صحیح مفہوم جو کہ وحی کے ذریعہ ہی سمجھ میں آتا ہے، اس سے وہ لوگ واقف تھے؟ درآنحالیکہ وہ وحی سے ناآشنا تھے۔ کیا قریش کا مقابلہ تاریخی طور پر ثابت ہے؟ ایک مولانا صاحب نے اپنی کتاب میں اشعار نقل کیے ہیں جو آپ کے بیان کے خلاف نقلی دلیل بنتے ہیں۔

جواب: اللہ کا شکر ہے کہ لشکر کے مقابلہ میں عربوں کی مزاحمت کو آپ نے مان لیا کہ وہ توکل کے اس تصور کے مطابق ہے جو قرآن سے معلوم ہوتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ کیا وہ لوگ بھی توکل کا یہ مفہوم سمجھتے تھے جو کہ وحی سے ثابت ہے تو یہ بات یاد رکھیے کہ ہمارا دین تمام تر فطرت پر مبنی ہے۔ جن لوگوں کی فطرت سلیم ہوتی ہے وہ ان باتوں کو بدیہی طور پر جانتے ہیں۔ خاص طریقہ پر ان معاملات میں، جو کہ انسانی فطرت کے تقاضوں سے متعلق ہوتے ہیں، کوئی قوم بھی اتنی بلید نہیں ہوتی کہ جب تک پیغمبر نہ بتائے ان کو نہ سمجھے۔ دین کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ ایک چیز کو دل مانتا ہے، اس پر گواہی دیتا ہے، اس کو حق تسلیم کرتا ہے لیکن اغراض، نفس پرستی یا ضد اور ہٹ دھرمی اس کی مخالفت کراتی ہیں۔ نبیوں کا مقابلہ ایسے لوگوں سے رہا ہے جو جان بوجھ کر ان کے پیغام کو حق سمجھتے ہوئے اس کے خلاف ہو گئے ہیں۔ جو لوگ سلیم الفطرت تھے، جن کے حجابات زیادہ مضبوط نہیں تھے، ان کے پاس دولت، سیادت و قیادت کا حجاب نہیں تھا، انہوں نے پیغمبر کی بات سنتے ہی کہا کہ یہ ہمارے دل کی آواز ہے اور اس کی خاطر ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہو گئے۔

عرب بڑے باغیرت تھے اور قریش تو گویا یوں سمجھ لیجیے کہ ان میں گل سر سبد تھے۔ ابرہہ کی لشکرکشی کے زمانے میں بھی قریش کے جو لیڈر تھے ان میں دونوں قسم کے لوگ تھے، وہ بھی تھے جو حق کی مخالفت کر سکتے تھے اور وہ بھی جو حق کی حمایت میں اپنا سب کچھ قربان کر سکتے تھے۔ آخر انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جب موسیٰ کی قوم نے کہا کہ اذھب انت و ربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون، یعنی اے موسیٰ تو اور تیرا رب دونوں جا کر جنگ کرو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں، تو ان سے کہا گیا کہ اب چالیس سال کے لیے صحرا میں بھٹکتے پھرو۔ اگر قریش بھی میدان سے بھاگ کھڑے ہوتے تو اللہ تعالیٰ ان سے الگ معاملہ کیوں کرتا؟ واقعہ یہ ہے کہ قریش نے ابرہہ کا مقابلہ کیا اور جو کچھ ان کے بس میں تھا انہوں نے کیا۔ انہوں نے سوچا کہ دل بادل فوج کا مقابلہ صف بندی کر کے تو ممکن نہیں البتہ گوریلا جنگ سے ہو سکتا ہے۔ پہاڑوں کے اوپر وہ چڑھ گئے اور وہاں سے انہوں نے پتھر برسائے، یہ سنگ گل کی قسم کے پتھر تھے جو بڑی آسانی سے فلاخنوں میں استعمال کیے جا سکتے ہیں، اس سے انہوں نے سنگ باری کی۔ بہرحال جو کچھ ان کے پاس طاقت تھی انہوں نے میدان میں ڈال دی تب اللہ تعالیٰ نے ابرہہ اور اس کی فوج کو کھائے ہوئے بھس کی طرح کر

دیا۔ اللہ تعالیٰ نے چڑیوں کے لیے دسترخوان بچھا دیا جنہوں نے ان کا گوشت کھایا۔ تو قریش نے ٹھیک توکل کا مظاہرہ کیا۔ اس میں کسی تعلیم کی کیا ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تعلیم انسانی کے لیے جو فطرت بنائی ہے اس کا علم کافی ہے۔ کیا ہم اپنے رب کے گھر کی حفاظت کے لیے جو ہماری تمام غیرت و آبرو کا مرکز ہے، جو کچھ کرنا ہے نہیں کریں گے؟ اس کے لیے کسی باریک فلسفہ کی ضرورت نہیں ہے، فطرت سلیم ہی کافی ہے۔

باقی رہ گئی یہ بات کہ کسی صاحب نے تاریخی طور پر اور بھی کچھ دلائل نقل کیے ہیں تو یہ جاننا چاہیے کہ دلیل کے طور پر صرف ان شعراء کا کلام ہی سند ہو سکتا ہے جو اس زمانے کے ہیں کہ جس زمانے کا یہ واقعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے تقریباً چالیس سال پہلے کا یہ واقعہ ہے تو اس زمانہ کے شعرا کا کلام اس معاملہ میں صائب ہو سکتا ہے، دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اور یہ امتیاز کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ تاریخ کی کتابوں سے یا ادھر ادھر سے لے کر نقل کر دیا کہ ہم بھی کچھ شعر جانتے ہیں حالانکہ واقعہ ہے کہ نہ انہیں شعر کی خبر، نہ شاعری، نہ شاعری کی۔ میں نے جو اشعار پیش کیے ہیں یہ اس زمانے کے اشعار ہیں۔ ان لوگوں کے ہیں جو اس واقعہ کے عینی شاہد ہو سکتے ہیں۔ یہ امتیاز کرنا مشکل ہے کہ عینی شاہد کون ہے۔ لیکن میں نے جن کو عینی شاہد سمجھا ہے ان کی شہادت پیش کی ہے۔ پھر یہ ہے کہ بنیاد صرف ان اشعار پر نہیں ہے بلکہ بنیاد دوسری چیزوں پر ہے، اشعار آپ کے لیے مزید رہنمائی کا باعث ہیں۔

سوال: رسول اور نبی کا فرق واضح فرمائیں۔ میرا ذہن اس معاملہ میں صاف نہیں ہے کہ قرآن میں جن کا ذکر ہے ان میں نبی کون ہے اور رسول کون ہے؟

جواب: اگر آپ کا ذہن اس بارے میں صاف نہیں ہے کہ آپ متعین طور پر بتا سکیں کہ انبیاء و رسل میں سے کون نبی ہے اور کون رسول ہے تو یہ مسئلہ الگ ہے۔ اور اگر یہ مسئلہ ہے کہ نبی اور رسول میں کیا فرق ہے تو یہ مختصر سی بات ہے۔ رسول کی بعثت کسی قوم کی طرف اس نوعیت کی ہے کہ وہ یہ کہے کہ میرا اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ پیغام ہے، مانو گے تو نجات پا جاؤ گے، نہیں مانو گے تو میں یوں ہی واپس نہیں جاؤں گا بلکہ تمہارا فیصلہ کر کے جاؤں گا۔ وہ یہ پیغام لے کر آتا ہے یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عدالت ہوتا ہے۔ نبی کا کام بھی اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچانا ہوتا ہے۔ وہ نیکی کی دعوت دیتا ہے، اصلاح بھی کرتا ہے لیکن اس کو یہ اتھارٹی نہیں حاصل ہوتی کہ کہہ سکے کہ تخت یا تختہ کر کے جاؤں گا۔

اب رہ گئی یہ بات کہ قرآن میں جن کا ذکر ہے ان میں سے کون رسول نہیں ہے صرف نبی ہے تو جن انبیاء اور رسل کا ذکر ہے میرا خیال ہے ان میں ارسلنا کے ساتھ جن کا ذکر آیا ہے، ان کا رسول ہونا بالکل واضح ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے بعد انبیائے بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کا شمار کر

کے ان دونوں کا رسول ہونا بتا دیا۔ ان کے علاوہ باقی سب نبی ہیں۔ ان میں کتنے محراب اور منبر کے درمیان قتل کر دیے گئے لیکن رسول جو آتا ہے تو اس کی شان اور ہوتی ہے۔ اس پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ رسول اور نبی میں فرق واضح ہیں کہ کون کون ہے۔

آنحضرت ﷺ کا قول ہے کہ 'علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل'۔ اس روایت کا مطلب یہ ہے کہ جو ذمہ داری بنی اسرائیل میں انبیاء سے متعلق تھی اس ذمہ داری کو اس امت میں علماء کے حوالہ کیا گیا ہے۔ جو فریضہ بنی اسرائیل میں انبیاء کے سپرد تھا وہ فریضہ میری امت میں علماء کے سپرد کیا گیا۔ قوم کی نگرانی، ان کی اصلاح، ان کی حفاظت کا کام ان ہی کے سپرد تھا اور یہی فریضہ اس امت میں ہمارے علماء کے سپرد ہے۔ ہمارے جو عالم ہیں ان کا فرض ہے کہ اپنی قوم کی اصلاح کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دیں۔

سوال: آپ نے فرمایا ہے کہ اولیاء اور صالحین کی دعائیں ہمارے شامل حال رہتی ہیں۔ اس سے بظاہر یہ تاثر ملتا ہے کہ آپ استمداد انبیاء اور اولیاء وغیرہ کے بریلوی نقطہ نظر سے متفق ہیں؟

جواب: جو کچھ میں نے کہا ہے اس میں اولیاء کو تو میں نہیں جانتا، اولیاء کا لفظ میں نہیں جانتا کہ آپ لوگ کہاں سے لائے ہیں۔ میں انبیاء کو جانتا ہوں، صالحین کو جانتا ہوں، اتقیاء کو جانتا ہوں۔ اور استمداد کا مطلب ان کی رہنمائی، ان کی قیادت، ان کی تعلیم اور ان کا طریقہ ہے۔ یہ سب چیزیں ہمارا سرمایہ ہیں۔ اس سے ہم کیسے الگ ہو سکتے ہیں۔ انبیاء ہی نے ہماری رہنمائی کی ہے۔ ہماری امت کے جو علماء اور صالحین ہیں ان کا علم، ان کی فقہ اور ان کی باتیں یہ سب ہمارا ورثہ ہیں۔ استمداد کرنے میں یہ بات یاد رکھیے کہ ہم اسی کام میں کریں گے جس میں وہ ہماری مدد کر سکتے ہیں اور جس حد تک کر سکتے ہیں۔ اگر آپ ان سے یہ استمداد کریں گے کہ فلاں ولی آ کر مجھے بیٹا دے تو بیٹا دینا ان کا کام نہیں ہے۔ اگر آپ صحت مند ہیں اور اللہ کا کرم ہو، اس کا فضل ہو تو بیٹا ہوگا، کوئی ولی صاحب کیا کریں گے۔

سوال: کسی بستی میں حدود اللہ توڑے جا رہے ہیں اور قتل و غارت گری کا دور دورہ ہے اور اس میں کوئی صاحب ذاتی طور پر صوم و صلوٰۃ کے پابند ہوں تو کیا وہ عند اللہ بری کیے جا سکتے ہیں؟

جواب: اگر اس بات کا موقع ہو کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جو ان کی بات سنیں گے تو ان کو چاہیے کہ ان تک پہنچنے کی کوشش کریں اور ان کو نصیحت کریں۔ لیکن اگر کوئی نیک نہیں، سب ہی غنڈے ہیں تو ان کے منہ لگنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ نصیحت کا بھی ایک محل ہوتا ہے۔ آپ نے اصحاب کہف کے قصہ میں دیکھا ہوگا۔ اصحاب کہف کے متعلق بھی بڑی غلط فہمی ہے۔ وہ یہ کہ دین کی خدمت کا ایک طریقہ غار نشینی بھی

ہے۔ حالانکہ اصحاب کہف غار میں اس وقت گئے جب کہ ان کو سنگسار کرنے کی دھمکی دی گئی اور وہ اپنی دعوت کی ذمہ داریوں سے پورے طریقے سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ غار میں پناہ لینا ان کے لیے ہجرت تھی۔ اب غار نشینی کوئی دین نہیں۔ یہ صوفیوں کا دین ہے۔ اسلام سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔

بہرحال حق میں اس کی گنجائش ہے تو صرف روزہ نماز پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے بلکہ حکمت اور دانش کے ساتھ لوگوں کو بتانا چاہیے اور اس کے بغیر بستی کو چھوڑنا بھی نہیں چاہیے۔

سوال: آیت "التائبون العابدون .... الخ" میں **والحفظون لحدود الله** آیا ہے۔ کیا اس میں اقامت دین کی طرف اشارہ ہے؟

جواب: آیت کے الفاظ واضح ہیں۔ اس میں کوئی اشارہ نہیں ہے، کنایہ بھی نہیں ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار بخشیں تو پھر وہ یہی کام کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں وغیرہ۔ اقامت دین ایسے معاشرہ کی ذمہ داری ہے؟ نظم طاقت رکھتا ہے۔ اپنے امیر اور مامور رکھتا ہے۔ ہمارا اور آپ کا کام صرف شہادت حق ہے۔ جہاں بھی ہوں حق بات کی شہادت دیتے دیں۔ اس سے گریز نہ کریں۔ ہمارے اور آپ کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت کرے گا، تمہاری مدد کرے گا اور ابتلا کو برداشت کرو گے اور صبر کرو گے تو آخرت میں تمہیں صلہ دے گا۔ آپ کے لیے کسی حکومت وغیرہ کا کوئی وعدہ نہیں ہے۔ اس چکر میں نہ پھنسیے۔ باقی جب نظم معاشرہ وجود میں آئے گا تو اقامت دین کرے گا۔ آپ کسی چیز کے طالب نہ بنیں۔

علامہ اقبال کے متضاد خیالات:

سوال: علامہ اقبال عقل کو مطعون کرتے ہوئے کہتے ہیں:

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو، وہ دل نہ کر قبول

کیا آپ اقبال کے ان خیالات سے متفق ہیں؟

جواب: ۔ اقبال بہرحال شاعر ہیں اور شاعروں کے متعلق آپ اللہ میاں کی شہادت پڑھ چکے ہیں کہ فی کل واد یہیمون، ہر وادی میں ان کی دلچسپی ہوتی ہے۔ یہ بات بھی ہے کہ شاعروں کو مرفوع العلم مانا گیا ہے۔ جن چیزوں کے اوپر مولوی حضرات دوسروں پر کفر کا فتویٰ دے دیتے ہیں تو شاعر کو تو نہیں دیتے۔ اللہ میاں تو یہ خبر دیتے ہیں کہ میں نے روز اول ذریت آدم کو ان کی پیٹھوں سے نکال کر الست بربکم کہا تو سب نے جواب دیا **بلٰی**۔ معلوم نہیں جبریل نے اقبال کو کہاں سے یہ رپورٹ دے دی کہ جو عقل کا غلام

ہو وہ دل نہ کر قبول۔ ویسے یہ بات ہے کہ ہر عاقل کے کلام کا ایک محل ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اقبال نے فلاسفہ کی عقل کو مطعون کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ عقل کے گھوڑے دوڑاتے ہیں اور بڑی انکل پچو باتیں کرتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ انہی میں کچھ بڑے قابل لوگ بھی ہیں۔ بعض ایسے فلسفی بھی ہیں کہ ہیں وہ کافر لیکن ان کی بات بڑی مومنانہ ہے۔ اب یہی دیکھئے کہ افلاطون فلاسفر ہے لیکن وہ اس بات کا قائل ہے کہ عالم غیب میں تمام خیر وشر انسان پر واضح کر دیا گیا ہے۔ یہ معمولی بات نہیں ہے۔ یہ قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ افلاطون نے اپنے فلسفہ کی رو سے بھی یہی بات کہہ دی ہے۔ میرے نزدیک اقبال نے درحقیقت ملحد فلسفیوں کو مطعون کیا ہے اور ٹھیک کیا ہے۔

مولانا روم نے یہ جو کہا ہے کہ 'پائے استدلالیاں چوبیں بود' تو انہوں نے بھی عاقلوں پر نہیں، بلکہ جاہل متکلمین پر چوٹ کی ہے۔ متکلمین بڑے ہی بے خبر ہیں، یہ نہ تو فلسفہ جانتے ہیں اور نہ قرآن جانتے ہیں۔ یہ ناقل ہیں یونانی فلسفہ کے اور ارسطو ان کا امام ہے۔ اسی سے انہوں نے سب کچھ لیا ہے اور ہر چیز ان سے غلط ہو کر رہ گئی ہے۔ کوئی چیز صحیح نہیں بجز اس کے جو یونانی فلسفیوں کے ہاں صحیح تھی۔

سوال: آپ نے کہا تھا کہ ڈاکٹر اقبال کے مخصوص نظریات جو کہ تصوف سے قریب تر ہیں اسلام کے مطابق نہیں ہیں۔ دوسری طرف آپ ان کی ستائش کرتے ہیں۔ شاید میں نے سمجھنے میں غلطی کی ہے، براہ مہربانی رہنمائی فرمائیں۔

جواب: میں نہایت محبت کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپ نے سمجھنے میں ضرور غلطی کی ہے۔ رائے کا اظہار مجموعی حالات کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر ڈاکٹر صاحب کی شاعری میں جو بات ہے وہ کسی اور کی شاعری میں نہیں، یہاں تک کہ ان کے مرشد مولانا روم بھی ڈاکٹر صاحب سے زیادہ صاف نہیں ہیں۔ یہ تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا روم نے اشاعرہ کے علم کلام کو شاعری بنا دیا اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کی بعض چیزیں ہیں بہت عمدہ، لیکن ڈاکٹر صاحب اپنے پیغام میں ان سے زیادہ واضح ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے زیادہ اور عمدہ خانقاہی کردار پر تنقید کوئی نہیں کرتا۔ پھر یہ بات ہے کہ وہ خانقاہی کا لفظ جب کہہ دیتے ہیں تو سمجھ لیجئے کہ سب کی آبرو بچا لیتے ہیں۔ یہ ان کا خاص کمال ہے۔ ڈاکٹر صاحب شاعر ہیں، قرآن کے کوئی مفسر نہیں ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے خیالات بیشتر پاکیزہ ہیں۔ لیکن ایسی چیزیں بھی مل جاتی ہیں جو قابل اعتراض ہیں۔ اب ان کے فلسفہ خودی کو لیجئے۔ مطلب سیدھا سادہ تھا۔ ہم لوگ تو یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کا جو شعور ذات ہے یا انا کا جو شعور ہے، یہ بہت ضعیف ہو گیا ہے جس کی وجہ سے وہ بالکل چھوئی موئی بن گئے ہیں اور کردار ایسا ہو گیا ہے کہ ان میں بالکل جان نہیں ہے۔ تو ڈاکٹر صاحب اس کو ابھارنا

چاہتے ہیں۔ ان کے شاگردوں نے یا قدر دانوں میں سے بعض نے ذہانت دکھائی اور ان کی خودی میں کچھ سوال کیے تو انہوں نے بے خودی کو بھی فلسفہ بنا دیا اور وہ بن گیا۔ اب نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی خودی بے خودی وہ سمجھتے ہیں یا ان کے شارح مرزا منور سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب شعر کے بادشاہ ہیں لیکن شاعر کے متعلق ایک بات یاد رکھیے جو قرآن نے کہی ہے کہ شاعر ہر وادی میں بھٹکتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ان کی بعض نظمیں پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ مارکس کے سوا اور کوئی یہ بات کہہ نہیں سکتا۔ بس کبھی طبیعت ترنگ میں آ گئی تو انہوں نے کہہ دیا۔

علی ہجویری کی تعریف میں لکھا ہے 'مرقد او پیر سنجر را حرم' ان کی قبر پیر سنجر کے لیے حرم ہے۔ یہ مرقد پیر سنجر کے لیے حرم رہی ہو گی لیکن ہم تو یہ جانتے ہیں کہ جس کے لیے بھی یہ مرقد حرم بنا ہے اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے۔ ڈاکٹر صاحب خانقاہی کردار پر اس زور سے حملہ کرتے ہیں کہ میرا بھی دل خوش ہو جاتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ باتیں بھی کہہ دیتے ہیں تو تعریف کرنے میں ان لوگوں پر زیادہ اعتبار نہ کیجیے۔

نیز شاعر کے متعلق وہ بات بھی یاد رکھیے جو قرآن نے کہی ہے کہ **"یقولون مالا یفعلون"** وہ کہنے کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ قوال ہوتے ہیں فعال نہیں ہوتے۔ وہ قوالی کو دین سمجھتے ہیں کہ ہم نے آسمان و زمین کے قلابے ملا دیے۔ یہ بھی کوئی عیب کی بات نہیں، شاعر بڑی چیز ہوتا ہے۔ میں نے اس پہلو سے بھی ڈاکٹر اقبال پر اعتراض نہیں کیا، میرے نزدیک وہ فعال ہو نہیں سکتے تھے۔ ان کا اپنا قول ہے کہ میں گاتا ہوں، میرا کام گانا ہے (اب ناچوں بھی میں ہی!) تو اقبال کو جو لوگ مفسر بھی، محقق بھی، فقیہ بھی، سب کچھ بنائے بیٹھے ہیں، گویا سارا نظام زندگی ان کے محور پر گھوم رہا ہے تو یہ غلطی ہے۔ ان کے خطبات کو دیکھیے جب یہ چھپے تو مجھے بڑا غصہ آیا اور میں اس پر تنقید لکھنا چاہتا تھا لیکن اور کاموں میں مشغول ہو گیا، نہیں لکھ سکا۔ وہ خطبات حرف حرف غلط ہیں۔ لیکن وہی اقبالیات کے علمبرداروں کا صحیفہ ہیں۔

شاعر میں جو خوبی ہے اس کی داد دیجیے۔ آپ کو میری باتوں میں تضاد نظر آیا ہے تو شاعر کی باتوں میں بھی تضاد ہے۔ جب بھی شاعر کے بارے میں کچھ کہوں گا تو اس تضاد کی وبا مجھے بھی اپنے گھیرے میں لے لے گی۔

(ترتیب: سید اسحاق علی)

§ § § § §

نئی اشاعت

تفسیرِ قرآن کے اصول

تالیف: امام حمید الدین فراہی — ترجمہ و ترتیب: خالد مسعود

موضوعات

1- قرآن میں تدبر و تفکر کی دعوت [illegible]
2- قرآن مجید کی ترتیب
3- قرآن ایک [illegible]
4- اصولِ تفسیر کو مدون کرنے کی ضرورت
5- اصولِ تفسیر سے متعلق [illegible]
6- تفسیرِ قرآن کے اصول
7- اصولِ تاویل

قیمت -/80 روپے

[illegible]

مصنف: مولانا امین احسن اصلاحی — ترتیب: عبداللہ غلام احمد

موضوعات

- فہمِ قرآن کے لیے چند بنیادی اصول
  1- قرآن مجید [illegible]
  2- قرآن مجید [illegible]
  3- قرآن [illegible]
  4- قرآن [illegible]
  5- قرآن [illegible]
- [illegible]
- [illegible]

قیمت -/34 روپے

[illegible]

مصنف: [illegible]

- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]

قیمت -/36 روپے

ملنے کا پتہ

[illegible]

1- [illegible]
2- [illegible]